# مشاجراتِ صحابہ اور مقامِ صحابہ کا مسئلہ

محمد زاہد
جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میری کتاب "خلافتِ علی احادیثِ نبویہ کی روشنی میں" کے آخر میں "مشاجراتِ صحابہ اور مقامِ صحابہ کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک ضمیمہ شامل کیا گیا تھا، جس میں اس بحث کو دیکھا گیا تھا کہ اگر حضرت علی کی خلافت منعقد اور برحق تھی، اور اس کے نتیجے میں ان کے قتال وغیرہ کے فیصلے بھی شرعاً درست تھے تو حضرت علی کے مدمقابل آنے والے صحابہ کو کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ اردو زبان میں شاید یہ سب سے زیادہ منقح تحریر ہو، اس لیے کئی دوستوں کا خیال تھا کہ اس کی الگ سے اشاعت کی جائے۔ ہارڈ شکل میں اشاعت کے تو وسائل دستیاب نہیں تھے، اس لیے فی الحال اس ضمیمے کو سافٹ شکل میں الگ سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اللہ تعالی اسے نافع بنائیں اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔

محمد زاہد

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

۱۵ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

# مشاجراتِ صحابہؓ اور مقامِ صحابہؓ کا مسئلہ

محمد زاہد
جامعہ اسلامیہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد

اہل السنت والجماعت کا یہ عمومی رخ بھی ہے اور احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت ایک جائز، منعقد خلافت اور خلافتِ راشدہ تھی۔ آپ کے قتال کے فیصلوں سمیت آپ کے بنیادی پالیسی کے فیصلے شرعی طور پر درست اور صواب تھے۔ اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسری طرف جو حضرات تھے وہ بھی تو آخر صحابہ ہی تھے، پھر ان کے بارے میں اور ان کے ان اقدامات کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ اس بارے میں بھی اہل السنت والجماعت کی اعتدال پر مبنی ایک گائیڈ لائن موجود ہے جسے نصوص سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، تاہم یہاں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جائیں گے۔

اس بات میں اہل السنت کی دو رائیں نہیں ہیں کہ انسانوں میں مجموعی فضیلت کا حامل سب سے بڑا طبقہ انبیا ورسل علیہم الصلوۃ والتسلیم کا ہے۔ ان کے بعد کائنات کے خوش قسمت ترین افراد وہ ہیں جنھوں نے براہِ راست کسی نبی یا رسول کا دور پایا، اس پر ایمان لایا، اس کے زمانے میں اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے اور اس کی مدد کی وغیرہ وغیرہ۔ جتنے اعلی مقام کے حامل نبی کی صحبت کسی کو میسر آئی، اتنی ہی بڑی سعادت کا مالک بنا۔ ہمارے نبی محمد مصطفی ﷺ سید الانبیاء، افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں، اس لیے اس کائنات میں ایمان کے ساتھ آپ کی صحبت پانے سے بڑی سعادت کوئی نہیں ہو سکتی؛ اس لیے انبیا کے بعد جس طبقے کا سب سے اونچا مقام ہے، وہ اللہ کے آخری نبی کے صحابہ کا طبقہ ہے۔ صحابۂ کرام کے

بارے میں عمومی اور بعض افراد یا بعض طبقاتِ صحابہ کے بارے میں خصوصی نصوص موجود ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، نہ ہی یہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے اس گفت گو کے مخاطبین کو قائل کرنے کی ضرورت ہو۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی صحابی سے کوئی غلط عمل سرزد ہونا ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو اس عمل اور عمل کرنے والے کے بارے میں کیا رائے اور رویّہ اختیار کیا جائے گا؟ اور الصحابۃ کلہم عدول والے اصول پر اس کا اثر مرتب ہوگا یا نہیں؟ اس معاملے میں پہلے عہدِ رسالت سے دو مثالوں پر نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد مسئلے کی تفہیم آسان ہو جائے گی۔ ایک مثال قرآنی واقعے سے لی جائے گی اور ایک حدیث سے۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا واقعہ پیش آتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ منافقین کی کارستانی تھی، لیکن، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بعض مخلص صحابہ بھی، جو منافق ہرگز نہیں تھے، اپنی سادگی اور قلتِ فہم کی وجہ سے اس سنگین معاملے کا حصہ بن گئے۔ شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کئی روز کی پریشانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات اتاردیں۔ ان آیات میں جہاں ام المؤمنین کی اس الزام سے براءت اور ان کی پاک دامنی واضح طور پر بتائی گئی ہے، وہیں جو کچھ سرزد ہوا اس پر قرآن نے واضح حکم لگایا اور آئندہ کیا کرنا چاہیے وہ بھی بتایا۔ قرآن نے بتایا کہ اللہ اس ابتلا میں بھی خیر ہی پیدا فرمائیں گے۔ جو لوگ اس معاملے میں شریک ہوئے ان میں ایک تو وہ ہے جو اس سارے معاملے کا مرکز و سرچشمہ تھا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَه مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيْم، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عذابِ عظیم کی وعید بیان فرمائی، لیکن اس سے کم درجے میں جو لوگ شریک تھے، اگرچہ وہ مؤمن ہی تھے، قرآن نے

ان کی غلطی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بیان فرمائی اور بتایا:

- ❖ یہ جو تمھیں میں سے ایک گروہ اس بہتان میں شریک تھا ان میں سے جس شخص نے افک (بہتان طرازی) میں جتنا حصہ لیا ہے اس کے مطابق وہ گناہ گار ہے۔(لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْم.)[1]
- ❖ اہلِ ایمان کی ذمہ داری تھی کہ وہ یہ الزام سنتے ہی اپنے جیسے اہلِ ایمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے اور اس بات کو واضح بہتان قرار دیتے۔ (لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُبِين)[2] گویا جنھوں نے ایسا نہیں کیا وہ ایک ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر رہے یا یہ کہ اس موقع پر انھیں کیا کرنا چاہیے اسے درست طور پر سمجھنے سے وہ قاصر رہے اور یوں ایک فریضے کے تارک رہے۔
- ❖ اگر اس طرح کے الزام کو ثابت شدہ ماننا تھا تو ضروری تھا کہ وہ حسبِ قاعدۂ قرآنیہ چار گواہ لے کر آتے۔ چار گواہ تو درکنار یہاں تو ایک گواہ بھی ممکن نہیں تھا کہ واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔ چوں کہ مقررہ ثبوت ان کے پاس نہیں، اس لیے یہ سب اللہ کے قانون میں جھوٹے ہیں۔(فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللهَّ هُمُ الْكَاذِبُونَ.)[3] یہ جھوٹ کس درجے کا ہے؟اس کی

---

۱-النور ۲۴:۱۱۔

۲-النور ۲۴:۱۲۔

۳-النور ۲۴:۱۳۔

تفصیل خود سورۂ نور ہی کی آیت نمبر چار اور پانچ میں بیان ہوئی ہے کہ اگر چار گواہوں کے بغیر عام پاک دامن خاتون پر کوئی الزام لگاتا ہے (حرمِ رسول ﷺ کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ نازک ہے) تو اس کی سزا کا ایک حصہ یہ ہے کہ شریعت کا قانون اس کی زبان کا اعتبار ختم کر دے گا اور اب قاضی اس کی گواہی قبول کر کے اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرے گا اور اس طرح کی الزام تراشی کرنے والے اللہ کی نظر میں فاسق ہیں۔ ہاں ہر گناہ کی طرح یہاں بھی توبہ کی گنجائش ہے، اگر وہ توبہ کر لیں تو فاسق نہیں رہیں گے، بلکہ فقہا کی ایک جماعت کی تفسیر کے مطابق گواہی بھی قابلِ قبول ہو گی۔

- بذاتِ خود ان کا گناہ اتنا سنگین تھا کہ ہو سکتا تھا کہ یہ اللہ کے بڑے عذاب کا شکار ہو جاتے، لیکن چوں کہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال تھی، اس لیے ایسا نہیں ہوا۔ یعنی تمھارا عمل اپنی ذات میں عذابِ عظیم ہی کا موجب تھا، تاہم ایک عارض کی وجہ سے وہ تاثیر تمھارے حق میں ظاہر نہیں ہوئی۔ یہاں تعبیر کا فرق قابلِ توجہ ہے کہ سرغنے کے لیے تو فرمایا کہ اس کے لیے عذابِ عظیم ہے اور باقیوں کے لیے فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو عذابِ عظیم ہوتا جو در حقیقت اگرچہ شناعتِ فعل کے اعتبار سے عذاب کا اثبات ہے، لیکن واقعاتی اعتبار سے عذاب کی نفی ہے کہ کام تو تم نے سنگین عذاب والا کیا تھا، لیکن اللہ کے فضل اور رحمت سے تم عذاب کا مورد نہیں بنے۔
- تم اپنے خیال میں اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے، لیکن اللہ کے ہاں بڑی سنگین بات تھی۔
- آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ نے وہی بات دہرائی کہ تمھاری ذمہ داری تھی کہ سنتے ہی یہ کہہ دیتے کہ اس طرح کی بات کرنے کی ہمارے لیے کوئی گنجائش

موجود نہیں، یہ بہتانِ عظیم ہے۔

یہ سب باتیں قرآن آئندہ کے بارے میں نہیں کہ رہا، آئندہ کی بات تو اگلی آیت سے شروع ہو رہی ہے یَعِظُكُمُ اللهُ أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِه أَبَداً. یہ سب کچھ اب تک جو ہوا اس کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ گناہ کے مرتکب ہوئے، عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والا کام کیا، یہ لوگ جھوٹے ہیں، یہ لوگ اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ بات کہنے کی پوری گنجائش موجود ہے کہ یہ مخلصین جو قذف میں شریک ہوئے، وہ محض سادگی میں ہوئے۔ ام المؤمنین کے ساتھ کوئی ذاتی پرخاش وغیرہ اس کا باعث نہیں تھا۔ بادی النظر میں انھوں نے سمجھا ہوگا کہ فلاں بڑی ہستی سے اتنا بڑا گناہ سرزد ہوا، تو اس ایشو کو اٹھانا تو چاہیے۔ ان کی سادگی کو استعمال کرنے والے بھی ہوں گے، لیکن ان کی نیت کی صفائی کے باوجود اپنی ذات میں اس فعل کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں قرآن نے کوئی لچک نہیں رکھی۔ جو کچھ ان سے ہوا وہ ان کی سنگین غلطی تھی۔ نیت خراب نہ ہونے کا اثر اخروی نتائج میں تو لازماً مرتب ہوتا ہے، دنیوی حکم میں ایسا ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات پر حدِ قذف بھی جاری کی گئی۔ تاہم عند اللہ بہت سی باتوں میں اللہ کے فضل اور رحمت کی وجہ سے غلطی کی سنگینی کے کئی اثرات ان پر مرتب نہیں بھی ہوئے۔ یہاں قرآن جن کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے وہ مخلص صحابہ ہیں، منافقین نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کوئی غلطی اپنی ذات کے اعتبار سے سنگین نتائج کی موجب ہوتی ہے، لیکن کسی خاص صورتِ حال میں یا کسی خاص شخص کے حق میں وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، جیسا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمھارا عمل اپنی ذات کے اعتبار سے تو موجبِ عذاب تھا۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ ورسول، صحابہ سمیت کسی کی بھی غلطی کے لیے سخت الفاظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے پیشین گوئیوں کی حدیثوں میں کہیں سخت الفاظ نظر آئیں تو ان میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

اب اگلا اور یہاں اصل متعلقہ سوال یہ ہے کہ غلطی تو افک میں حصہ لینے والے مؤمنین کی سنگین ہے، لیکن کیا اس غلطی کی وجہ سے انھیں برا بھلا کہنا بھی شروع کر دیا جائے، انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنالیا جائے؟ خود قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ کے اپنے اسوہ اور صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرگز نہیں۔ خود قرآن کی انھی آیات میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ پر خرچ کرنے کا سلسلہ بند کرنے کا ارادہ کیا، تو اللہ تعالی نے اس سے منع کرتے ہوئے یہ خرچ جاری رکھنے کا حکم دیا اور کہا کہ ابو بکرؓ جیسے اہلِ فضل کو چاہیے کو وہ عفو اور درگزر سے کام لیں۔ جب اللہ دوسروں کو عفو کا حکم دے رہا ہے تو ظاہر ہے خود تو وہ سب سے زیادہ معاف کرنے والے ہیں، اس لیے اللہ نے بھی انھیں یقینا معاف کر دیا ہو گا، بلکہ یہ آیاتِ براءت سن کر نہ معلوم ان مخلص صحابہ پر کیا گزری ہو گی! ناممکن ہے کہ انھیں اپنی غلطی پر شدید ندامت نہ ہوئی ہو، اور یہی توبہ ہے، پھر حد بھی جاری ہو گئی، لہذا گناہ تو ان سے صادر ہوا، لیکن وہ اس سے پاک صاف ہو چکے۔ قیامت تک جب تک اس واقعے کا ذکر آئے گا، یہی کہا جائے گا کہ ان حضرات سے یہ غلطی سرزد ہوئی، لیکن اس کے علاوہ اس واقعے کے بعد خود عہدِ رسالت میں یا عہدِ صحابہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس غلطی کا انھیں طعنہ دیا گیا ہو، اس کی بنیاد پر انھیں سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا ہو، ان کو فاسق وغیرہ قرار دیا گیا ہو، ان پر لعن طعن کی گئی ہو۔ اس واقعے سے سب سے زیادہ اذیت اٹھانے والی تو خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ایک باغیرت خاتون کے لیے اس طرح کا واقعہ کتنی اذیت کا باعث بنتا ہے؟ یہ صرف وہی جان سکتا ہے جس پر گزری ہو۔ خود ام المؤمنین کا بیان کردہ واقعہ **صحیح بخاری** وغیرہ میں ہم پڑھتے ہیں تو گریہ قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خود ام المؤمنین کس اذیت سے گزری ہوں گی! اس کے باوجود **صحیح بخاری** میں ہی آتا ہے کہ عروہ نے اُم المؤمنین کے سامنے حضرت حسان بن ثابتؓ، جو اس افک میں شریک تھے، کو برا بھلا کہا تو حضرت عائشہؓ نے منع کر دیا۔ وجہ یہ بیان

فرمائی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا اپنی شاعری کے ذریعے دفاع کیا کرتے تھے۔[۴] گویا ام المؤمنین یہ سبق دے رہی ہیں کہ کسی کی بس غلطی کو لے کر نہیں بیٹھ جایا کرتے، اگر اس نے اچھے کام کیے ہوں تو انھیں بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ تو قرآن کا بھی بیان کردہ اصول ہے کہ نیکیاں برائیوں کے ازالے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، تو حسان بن ثابتؓ کی جہاں ایک غلطی ہے وہیں مدافعتِ رسولؐ جیسی نیکیاں بھی ان کے کھاتے میں موجود ہیں۔ اس خاص واقعے میں اس یقین کے باوجود کہ ان کا عمل سراسر غلط تھا، کبھی ہمارے دل میں ان تینوں حضرات کے احترام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہو گی۔

دوسری مثال ہم ذکر کر سکتے ہیں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کی۔ بعض صحابی ایسے ہیں جو محض ایک واقعے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید ان کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ جیسے عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ اذان کے خواب کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا ذکر شاید صرف زنا کے صدور کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔ ان سے یہ سنگین گناہ سرزد ہوتا ہے، خود آکر اقرار کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے اعراض کے باوجود بار بار اقرار کرتے ہیں، جب جرم پورے طور پر ثابت ہو جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ رجم کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ اب ماعز اسلمیؓ سے جو کچھ سرزد ہوا، تھا تو وہ گناہ ہی؛ جب واقعے کا ذکر ہو گا تو یہی کہا جائے گا کہ انھوں نے زنا کیا، اس فعل کو کوئی اور رنگ نہیں دیا جا سکتا، یہی فقہا و محدثین وغیرہ کہتے چلے آئے ہیں، لیکن کیا اس بنیاد پر ان پر سب وشتم بھی جائز ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ہر گز نہیں۔ یہ صرف ہماری عقیدت کا معاملہ نہیں، خود ماعزؓ کے جرم کا ثبوت

---

۴-صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب حديث الإفك، رقم: ۴۱۴۵۔

تسلیم کر کے رجم کا حکم صادر کرنے والے نبی کی تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ایک بڑی جماعت کے درمیان تقسیم کر دی جائے تو ان کے گناہ بخشوانے کے لیے کافی ہو جائے۔(۵) دو شخصوں نے ماعز اسلمیؓ کے بارے میں نامناسب جملے کہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو ایک مردار پھولے ہوئے گدھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس میں سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کیا اسے کیسے کھایا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا تم نے اپنے بھائی کی عزت کے حوالے سے جو ابھی بات کی، وہ اس گدھے کا معمولی حصہ کھانے سے زیادہ گھناؤنا کام تھا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، وہ [ماعز] تو اس وقت جنت کی نہروں میں ڈبکیاں لگا رہا ہے۔(۶)

صحابہ کے بارے میں یہ اہل السنت کا طریقہ نہیں کہ روافض کی طرح کچھ کو تو معصوم قرار دے کر پوجا جائے اور کچھ پر سب و شتم کی جائے۔ اہل السنت کے نزدیک احترامِ صحابہ در حقیقت حبِّ رسول کا تکملہ ہے۔ اس لیے اس نبی سے صحبت رکھنے والے گناہ بھی کر بیٹھیں، تب بھی ہمارے نزدیک وہ محترم ہیں کہ وہ ہمارے نبی سے نسبت رکھتے ہیں۔ اہل

---

۵ -**صحیح مسلم** کے الفاظ ہیں: لقد تاب توبة لو قسمت بين أمة لوسعتهم. (كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى، رقم:۱۶۹۵۔)

۶ -**سنن الدار قطني** کے الفاظ ہیں: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّهُ الْآنَ لَفِي أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ فِيهَا. (**سنن الدار قطني**، كتاب البيوع، كتاب الحدود والديات وغيره، رقم:۳۴۴۲۔)

السنت کے ہاں قرآن وسنت کی روشنی میں صحابہ کے بارے میں معتدل طرزِ عمل یہ ہے کہ قذف جیسا گناہ، جس کی سنگینی سورۂ نور کی آیتوں سے واضح ہو رہی ہے، سرزد بھی حرمِ رسول ﷺ کے بارے میں ہوا(یہ آیاتِ براءت کے نزول سے پہلے کی بات ہے، وگرنہ اب یہ الزام دہرانا کفر ہے۔) اس سے زیادہ سنگینی کس غلطی کی ہو سکتی ہے۔ جرم، قذفِ زنا جیسا شنیع ہو، ثبوت کا معیار اتنا اعلی ہو کہ اللہ کے نبی نے حد جاری کرنے کا حکم جاری کیا ہو، اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر ثبوت کس قاضی کے فیصلے سے ہو سکتا ہے، لیکن ایک صحیح سُنّی جہاں غلط کام کو غلط ہی کہے گا، وہ یہ مانے گا کہ ان قاذفین سے سنگین غلطی سرزد ہوئی تھی، ماعز اسلمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا، وہیں وہ حسان بن ثابت، مسطح، حمنہ بنت جحش اور ماعز اسلمی رضی اللہ عنہم کی ذات کے بارے میں بے احترامی کا تصور بھی نہیں کرے گا، وہ اللہ کے نبی کے ساتھی ہونے کے ناتے، اللہ کے نبی کے مداح ہونے کے ناتے ان سے پیار ہی کرے گا؛ اس لیے کہ ایک صحیح سُنّی فعل پر حکم لگاتے ہوئے فعل کو دیکھتا ہے، ذات پر حکم لگاتے ہوئے ذات کو۔ کسی کی ذات کا دائرہ اس کے ایک آدھ غلط فعل سے بعض اوقات بہت وسیع ہوتا ہے، اس ذات میں کسی غلطی کے ساتھ ساتھ اس سے ہزاروں گنا بھاری اچھائیاں بھی موجود ہوتی ہیں اسی طرح اس کے برعکس بھی موجود ہے کہ کسی سے ایک آدھ اچھا کام صادر ہوا ہو مگر اس کے علاوہ بہت سے سنگین جرائم بھی اس کے کھاتے میں موجود ہوں۔

اب آیئے اصل سوال کی طرف کہ اگر کسی صحابی کی طرف کسی غلط فعل کی نسبت ہو رہی ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ تو اس سلسلے میں انتہائی اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض ہیں:

ا۔ یہ بات درست ہے کہ اہل السنت کی عمومی رائے[۷] کے مطابق انسانوں میں سے

---

۷۔ عمومی رائے کا لفظ اس لیے بولا ہے کہ بعض حضرات نے، مثلاً شاہ ولی اللہ کے خاندان کے کچھ حضرات نے غیر انبیا پر بھی عصمت کا اطلاق کیا ہے، ان کے

معصوم صرف انبیا ہی ہیں، انبیا کے علاوہ کوئی انسان معصوم نہیں ہوتا؛ اس لیے ہر انسان سے غلطی اور گناہ کا صدور ممکن ہے۔ اگرچہ تفصیل کا موقع نہیں تاہم عام غیر انبیا کے درجات کے تفاوت سے اس امکان میں بھی بہت زیادہ کمی بیشی ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ خود صحابہ کے اندر بھی۔ جس چیز کی نسبت ہم بآسانی ماعز اسلمیؓ کی طرف کر لیتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ وہاں اس طرح کے فعل کا امکان اتنا مضمحل ہو گا کہ تقریباً کالعدم ہی ہو گا۔ وہ معصوم تو نہیں، لیکن صدیق اکبر اور تقریباً اس پائے کے دوسرے صحابہ، معصومیت کے نیچے جو بلند ترین مقام ممکن ہے، انھیں اس پر فائز کہا جا سکتا ہے۔

۲. کسی بھی انسان کی طرف غلط فعل کی نسبت سامنے آنے پر سب سے پہلی ذمے داری ہم پر یہ عائد ہوتی ہے کہ ہم یہ جانچیں کہ یہ نسبت ثابت بھی ہے یا نہیں۔ صحابہ کرام کے مقام و مرتبے کی وجہ سے یہ ذمے داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے؛ اس لیے سب سے پہلے تو صحابی کی طرف ایسی کسی بات کے ثبوت کو دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس درجے کی ہے۔

۳. اگر نسبت درست ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کے لیے کوئی عذر، کوئی تاویل تلاش کر لینی چاہیے۔ بعض اوقات ایک کام اپنی ذات میں تو غلط ہوتا ہے، لیکن کسی عذر کی وجہ سے اس پر وہ حکمِ اخروی جاری نہیں ہوتا جس کا وہ عمل اپنی ذات میں مستحق ہوتا ہے۔ قبلہ سے رخ ہٹا کر نماز پڑھنا گناہ ہے، لیکن اگر کسی شخص کو قبلہ

---

ہاں بعض صحابہ اور بعض اولیا بھی عصمت کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہو: منصبِ امامت از شاہ اسماعیل شہیدؒ)۔

معلوم نہیں ہے، اس نے اندازہ لگا کر ایک طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تو امرِ واقعہ میں تو اس کی نماز غیر قبلہ کی طرف ہے، لیکن اسے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کا گناہ نہیں ہو گا۔ امام بیہقی نے محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ اگر تمھارے بھائی کی کوئی بات تم تک پہنچے تو اس کا عذر تراشنے کی کوشش کرو، اگر کوئی عذر سمجھ میں نہ آئے تو کہہ دو کوئی عذر ہو گا۔(۸) امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں اگر تم تک تمھارے بھائی کی نا مناسب بات پہنچے تو ایک عذر تلاش کرو، وہ نہ بنے تو دوسرا، یہاں تک کہ ستر عذر تک تلاش کرو، پھر بھی کوئی عذر نہ بنے تو کہہ دو شاید کوئی اس کا کوئی ایسا عذر ہو جو میری سمجھ میں آ سکا ہو۔(۹) اگر عام آدمی کے بارے میں حتی الامکان حسنِ ظن رکھنے کا یہ اصول ہے تو برگزیدہ شخصیات کے بارے

---

۸- **شعب الإيمان للبيهقي**، كتاب حسن الخلق، فصل في ترك الغضب الخ، **رقم**: ۷۹۸۹؛ *روایت کے الفاظ یوں ہیں*: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ، قَالَ: إِذَا بَلَغَكَ عَنْ أَخِيكَ شَيْءٌ فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْرًا، فَإِنْ لَمْ تَجِدْ لَهُ عُذْرًا، فَقُلْ: لَهُ عُذْرٌ.

۹- *نفسِ مصدر*، كتاب حسن الخلق، فصل في ترك الغضب الخ، **رقم**:۷۹۹۱؛ *روایت کے الفاظ یوں ہیں*: قَالَ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ: إِذَا بَلَغَكَ عَنْ أَخِيكَ الشَّيْءُ تُنْكِرُهُ فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْرًا وَاحِدًا إِلَى سَبْعِينَ عُذْرًا، فَإِنْ أَصَبْتَهُ وَإِلَّا قُلْ: لَعَلَّ لَهُ عُذْرًا لَا أَعْرِفُهُ.

میں بطریقِ اَوْلیٰ ہو گا۔

۴. اگر کسی وجہ سے التماسِ عذر (عذر تلاش کرنا) ممکن نہ ہو، یا کسی بھی بیان کی گئی تاویل پر اطمینان نہ ہو تو یہ حسنِ ظن رکھنا چاہیے کہ انھوں نے توبہ کرلی ہو گی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا ہو گا، جیسا کہ نصوص میں بعض واقعات میں اللہ کے معاف کرنے کی بھی تصریح ہے اور بعض واقعات میں توبہ کرنے کی بھی تصریح ہے۔

۵. اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں پر حکم ان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے لگتا ہے، اگر کسی سے کچھ گناہ سرزد ہو بھی جائیں، لیکن اس پر حسنات کا غلبہ ہو تو امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان حسنات کی وجہ سے سیئات کالعدم ہو جائیں گی۔ صحابہ کرام کے بارے میں بھی یہ گمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسناتِ کثیرہ کو سیئات پر غالب فرمائیں گے، چناں چہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> اس کا جواب جمہور علما کے نزدیک یہ ہے کہ صحابہ کرام سے اگرچہ کوئی کبیرہ بڑا گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے، اور ہوا بھی ہے، مگر ان میں اور عام افرادِ امت میں ایک فرق ہے کہ گناہِ کبیرہ وغیرہ سے کوئی شخص ساقط العدالۃ یا فاسق ہو جاتا ہے اب اس کی مکافات توبہ سے ہو سکتی ہے۔ جس نے توبہ کرلی یا کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی حسنات کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کا یہ گناہ معاف کر دیا وہ پھر عدل اور متقی کہلائے گا۔ اور جس نے توبہ نہ کی وہ ساقط العدالۃ فاسق [10] قرار دیا جائے گا۔ اب توبہ کے معاملے میں عام افرادِ امت اور

---

۱۰۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی بات اس اصول پر مبنی ہے کہ جس سے ایک بھی کبیرہ گناہ سرزد ہو جائے وہ فاسق ہے، فاسق کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے، مگر قرآن

صحابہ کرام میں ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ عام افرادِ امت کے بارے میں اس کی ضمانت نہیں ہے کہ انھوں نے توبہ کی یا نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی حسنات نے سب سیئات کا کفارہ کر دیا۔۔۔ مگر صحابہ کا معاملہ ایسا نہیں۔ اول تو ان کے حالات جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ گناہ سے کتنے ڈرتے اور بچتے تھے، اگر کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اس کی توبہ صرف زبانی کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ کوئی اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لیے پیش کر دیتا ہے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا ہے، جب تک قبولِ توبہ کا اطمینان نہیں ہو جاتا ان کو صبر نہیں آتا۔ صحابہ کرام کی اس خوف و خشیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان حضرات سے توبہ کرنے کا اظہار بھی نہیں ہوا ہم ان کے بارے میں بھی یہی ظن رکھیں کہ انھوں نے ضرور توبہ کر لی ہو گی۔ دوسرے ان کے حسنات اور سوابق اتنے عظیم اور بھاری ہیں کہ ان کے مقابلے میں عمر بھر کا ایک آدھ گناہ حق تعالیٰ کے وعدے کے مطابق معاف ہی ہو جانا چاہیے۔ وعدہ یہ ہے: إن الحسنات یذهبن السیئات.

وہ چند آیات ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں:

---

کریم کے سیاقات سے اس لفظ کی جتنی شناعت معلوم ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر بظاہر فاسق کی ان حضرات کی تعریف راجح معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ فاسق وہ ہے جس کا شر اس کے خیر سے زیادہ ہو۔ ایک آدھ گناہ کی وجہ سے صرف اسے ہی فاسق کہنا چاہیے جسے صراحتاً قرآن یا حدیث میں فاسق کہہ دیا گیا ہو، جیسا کہ قاذف کے بارے میں سورۂ نور میں کہا گیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس بات کی ضمانت دے دی کہ حضراتِ صحابہ سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کر لے گا، یا پھر نبی کریم ﷺ کی صحبت و نصرت اور دین کی خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔ اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہو گی کہ ان کا گناہ معاف ہو کر وہ صاف بے باق ہو جائیں۔ اسی لیے ان میں سے کسی کو بھی ساقط العدالۃ یا فاسق نہیں کہا جا سکتا۔

**مگر یہ سب تفصیل ان کے حکمِ اخروی کے بارے میں ہے، حکم دنیوی کے بارے میں اسی سے متصل مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:**

صدورِ گناہ کے وقت اس [صحابی] پر تمام وہی احکام نافذ ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں پر ہوتے ہیں۔ حدِّ شرعی یا تعزیری سزائیں جو عام مسلمانوں کے لیے ہیں وہ ان پر جاری کی جائیں گی۔ اور صدورِ گناہ کے وقت اس عمل کو فسق بھی کہا جائے گا، جیسا کہ آیت إن جاءكم فاسق بنبأ سے معلوم ہوتا ہے، مگر چوں کہ ان کی توبہ یا معافی بنصِ قرآن معلوم ہو چکی ہے اس لیے ان کو کسی بھی وقت ساقط العدالۃ یا فاسق نہ کہا جائے گا۔ كما حققه الآلوسي في روح المعاني تحت آية إن جاءكم فاسق.[۱۱]

**مفتی اعظمؒ نے کسی قدر فسق کے اطلاق کے لیے جو استدلال کیا ہے اور اسے علامہ آلوسیؒ سے نقل کیا ہے، مجھے آیت کی اس تفسیر سے اختلاف ہے، یعنی آیت سے جتنا فسق**

---

**۱۱ - مفتی محمد شفیع، مقامِ صحابہ، ۵۹۔**

حضرت مفتی صاحبؒ ثابت فرمارہے ہیں میرے نزدیک اتنا بھی اس سے ثابت نہیں ہورہا۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی ان عبارتوں اور اس طرح کی اہل السنت والجماعت کی بہت سی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اہل السنت صحابہ کے بارے میں جس حسنِ ظن اور ان کے ذکرِ خیر اور ان کے بارے میں کف لسان کے قائل ہیں، اس کا مطلب کیا ہے اور یہ حسنِ ظن کس راہ سے ہے؟ صحابہ کے ساتھ حسنِ ظن یا الصحابۃ کلہم عدول کا یہ مطلب اہل السنت کے نزدیک کبھی بھی نہیں رہا کہ ان سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا، ثابت شدہ غلطی کا انکار کر دیا جائے یا ثابت شدہ غلطی کا علمی مواقع پر بھی ذکر نہ کیا جائے۔ اگر غلطی ثابت شدہ نہیں ہے تو اس کا انکار کیا جائے گا، اگر ثابت شدہ ہے لیکن بادی النظر میں غلطی لگنے کے باوجود اس کی کوئی توجیہ ایسی بنتی ہے، جس سے وہ غلطی، غلطی نہ رہے تو توجیہ کی جائے گی، وگرنہ غلطی کو تسلیم کر کے مذکورہ بالا طریقِ کار کے مطابق حسنِ ظن سے کام لیا جائے گا اور اس خاص غلطی کو تسلیم کرنے اور علمی ضرورت کے تحت بیان کرنے کے باوجود سب وشتم اور برا بھلا کہنے سے گریز کیا جائے گا، جیسا کہ ماعز اسلمی، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی مثالوں میں عرض کیا اور جیسا کہ امامِ اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنوی نے حضرت معاویہ اور ان کی جماعت کو حضرت علی کے مقابلے باغی اور خاطی کہنے کے باوجود ساتھ ہی یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ انھیں برا بھلا کہنا جائز نہیں ہے۔

مفتی اعظمؒ ابن تیمیہؒ کی طویل عبارتوں کا خلاصہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اور جب سلف صالحین کا اہل السنت والجماعت کا اصول یہ پڑ گیا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو اب یہ سمجھیے کہ ان حضرات کے قول کا حاصل یہ ہے کہ بعض صحابہ کی طرف جو بھی گناہ یا برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر حصہ تو جھوٹ اور افترا ہے اور کچھ حصہ ایسا ہے جس کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حکمِ شرعی اور دین سمجھ کر اختیار کیا۔ مگر بہت سے لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ اور

حقیقت معلوم نہیں، اس لیے اس کو گناہ قرار دیا۔ اور کسی معاملہ میں یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ خطا اجتہادی نہیں بلکہ حقیقتاً گناہ ہی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا وہ گناہ بھی معاف ہو چکا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ انھوں نے توبہ کر لی (جیسا کہ بہت سے ایسے معاملات میں ان کی توبہ قرآن و سنت میں منقول و ماثور ہے) اور یا ان کی دوسری ہزاروں حسنات و طاعات کے سبب معاف کر دیا گیا اور یا اس کو دنیا میں کسی مصیبت و تکلیف مبتلا کر کے اس گناہ کا کفارہ کر دیا گیا۔ اس کے سوا اور بھی اسباب مغفرت کے ہو سکتے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ، جن کی تفسیر کا حوالہ اوپر مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے دیا، انھوں نے اپنے ایک رسالے میں یہ بات مزید وضاحت کے ساتھ فرمائی ہے۔ انھیں پتا چلا تھا کہ ہندوستان میں کچھ لوگ سُنّی کہلانے کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ پر سب و شتم کرتے ہیں تو انھوں نے **الأجوبة العراقية على الأسئلة اللاهورية** کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ صحیح روایات، بلکہ صحیحین کی روایات سے ثابت ہے کہ بعض صحابہ سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوئے، پھر ان کی عدالت کا اصول کیسے قائم کر لیا گیا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

وأجيب بأنه ليس مرادنا من كون الصحابة – رضي الله تعالى عنهم – جميعهم عدولا أنهم لم يصدر عن أحد منهم مُفُسّق أصلا ولا ارتكب ذنبا قط ، فإن "دون إثبات ذلك خرط القتاد"، فقد كانت تصدر منهم الهفوات ويرتكبون ما يُحَدّون عليه،

وإنكارُ ذلك مكابرة صرفة وعنادٌ محض وجهلٌ بموارد الآيات والأحاديث؛ بل مرادُنا أنهم لم ينتقلوا من هذه الدار إلى دار القرار إلا وهم طاهرون مطهرون تائبون آيبون ببركة صحبتهم للنبي - ﷺ - ونصرتهم إياه وبذل أنفسهم وأموالهم في محبته وتعظيمهم له أشد التعظيم سرا وعلانية، كما يدل على ذلك الكتاب وتشهد له الآثار.[۱۲]

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام صحابہ کو ہمارے عادل کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی سے کبھی کوئی باعثِ فسق بات صادر نہیں ہوئی یا اس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، کیوں کہ اس بات کو ثابت کرنا کانٹے چننے سے بھی مشکل کام ہے۔ان سے لغزشوں اور قابلِ حد امور کا صدور بھی ہو جاتا تھا۔اس کا انکار محض ضد، عناد اور آیات واحادیث کے محل سے جہالت کی بات ہے، بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی صحبت کی برکت، ان کی نصرت، آپ کی محبت میں اپنے جان ومال کے انفاق اور خفیہ وعلانیہ طور پر آپ کی نہایت تعظیم کے باعث پاک صاف اور تائب بن کر دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہوئے ہیں، جیسا کہ اس پر کتاب وسنت شاہد ودال ہیں۔

بات کو مرتکز رکھنے اور تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ہم نے عموماً عبارات نقل

---

۱۲-الوسی، الأجوبة العراقية، ۲۳۔

کرنے سے گریز کیا ہے۔ جو اکابر علمائے اہل السنت حضرات صحابہ کے بارے میں بد گمانی اور بد زبانی کے خلاف کتابیں لکھ رہے ہیں، وہ اپنی انھیں کتابوں میں مسئلے کو اس انداز سے منقح کر رہے ہیں کہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ہر گز نہیں کہنا چاہتے کہ کسی صحابی سے غلط فعل سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یا ان کی طرف غلط فعل کی نسبت کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے، بلکہ وہ وہی بات کہنا چاہ رہے ہیں جو اوپر پانچ نمبروں میں ہم نے ذکر کی ہے کہ یا تو اس فعل کی نسبت صحیح نہیں، یا اس میں تاویل ہو گی یا وہ مغفور ہے پھر آگے مغفرت کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ حضرت مفتی اعظمؒ ہی نے اپنی اسی کتاب **مقام صحابہ** میں ایک جگہ عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ **"صحابہ معصوم نہیں مگر مغفور و مقبول ہیں"**۔ کسی صحابی کا غلط فعل بھی ثابت ہو تب بھی فعل پر تو وہی حکم لگایا جائے گا، جو دلیلِ شرعی کا مقتضا ہے، لیکن صحابی کی ذات پر بالخصوص اس کے اخروی معاملے پر کوئی غلط حکم نہیں لگایا جائے گا۔ متعدد تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بہت سے ذہنوں میں یہ بیٹھ گیا ہے کہ صحابہ کے لیے مغفرت کا ذکر بھی ان کی شان کے خلاف ہے؛ اس لیے ان چند عبارتوں کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوا۔

ابن تیمیہؒ ہی کی بات نقل کرتے ہوئے مفتی اعظمؒ لکھتے ہیں:

> اور عشرہ مبشرہ کے علاوہ کسی معین ذات کے متعلق اگرچہ ہم یہ نہ کہہ سکیں وہ جنتی ہے، جنت ہی میں جائے گا مگر یہ بھی تو جائز نہیں کہ ہم کسی کے حق میں بغیر کسی دلیلِ شرعی کے یہ کہنے لگیں کہ وہ مستحق جنت کا نہیں ہے کیوں کہ ایسا کہنا تو عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کے لیے جائز نہیں جن کے بارے میں ہمیں کسی دلیل سے جنتی ہونا بھی معلوم نہ ہو۔ ہم ان کے بارے میں یہ شہادت نہیں دے سکتے کہ وہ ضرور جہنم میں جائے گا پھر افضل المؤمنین اور خیار المؤمنین (صحابہ کرام) کے بارے میں یہ کیسے جائز ہو جائے گا۔ اور ہر صحابی کے پورے اعمالِ ظاہر و باطنہ کی اور حسنات و سیئات اور ان کے

> اجتہادات کی تفصیل کا علم ہمارے لیے بہت دشوار ہے اور بغیر علم و تحقیق کے کسی کے متعلق فیصلہ کرنا حرام ہے اسی لیے مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں سکوت کرنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ بغیر علمِ صحیح کے کوئی حکم لگانا ناحرام ہے۔(۱۳)

یہاں ایک مرتبہ پھر ابن تیمیہ اور مفتی اعظمؒ سے اختلاف کی جسارت کروں گا کہ بالتعیین جنتی ہونے کی صراحت صرف دس صحابہ کے بارے میں نہیں اس کا دائرہ اس سے وسیع ہے۔ ان دس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی حدیث میں انھیں نام لے کر جنتی کہا گیا ہے، وگرنہ اور بھی متعدد صحابہ کو بالتعیین آپ ﷺ نے جنتی قرار دیا ہے۔

اس آخری عبارت سے یہ بھی واضح ہوا کہ مشاجرات کے بارے میں سکوت کا مطلب کیا ہے، وگرنہ ایسی بے شمار عبارات ہیں جن میں سکوت کی تلقین کرنے والے حضرات ہی نے ایک فریق کو بڑی صراحت کے ساتھ حق پر قرار دے کر دوسرے فریق کے عمل کو خطا قرار دیا ہے۔ پہلے ذکر ہوا ہے کہ ہمارے بھائی مفتی محمد مجاہد شہید رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مفصل فتوی لکھا تھا، جس میں انھوں نے اس نوع کی کافی عبارات جمع کر دی تھیں۔ خود مشاجراتِ صحابہ کے معاملے میں حضرت مفتی اعظمؒ نے اس کتاب **مقامِ صحابہ** میں حضرت علیؓ کے برحق ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں کف لسان کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف غیر ثابت شدہ غلطی منسوب نہیں کی جائے گی، جہاں غلطی ثابت ہو وہاں اس کی وجہ سے ان کی تفسیق، تضلیل وغیرہ نہیں کی جائے گی، اس غلطی کی وجہ سے انھیں سب و شتم کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا، ان پر لعن طعن نہیں کیا جائے گا، انھیں کافر یا منافق نہیں کہا جائے گا۔ یہ حکم عام تھا،

---

۱۳ - **مقامِ صحابہ**، ۱۰۲۔

مشاجراتِ صحابہؓ کے سیاق میں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی اس لیے محسوس ہوئی کہ یہاں چوں کہ مد مقابل فریق سے خطا کا صدور مسلمہ سا امر ہے، اس لیے شدتِ جذبات میں یا گروہ بندی میں غلطی کرنے والے حضرات کے بارے میں سب وشتم اور لعن وتفسیق کا راستہ کھل سکتا تھا۔ کف لسان غلطی ہی کی صورت میں درکار ہوتا ہے، کارناموں میں تو کف لسان نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جتنی کسی کی غلطی ہے اس کا بھی ذکر نہ کیا جائے، بالخصوص جہاں نصوص نے کسی خاص غلطی کا درجہ متعین کر دیا، وہاں اس نص کے مقتضا ہی کو مانا جائے گا، لیکن مذکورہ تشریح کے مطابق کفِ لسان کے ساتھ؛ وگرنہ کل کوئی یہ بھی کہے گا کہ ماعز اسلمی سے زنا کے صدور اور ان پر حد جاری ہونے کا ذکر کرنا بھی عظمتِ صحابہؓ کے منافی ہے، قذفِ عائشہؓ میں شریک ہونے والوں کے بارے میں قرآنی تعبیرات ناقابلِ ذکر ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ حضرت علیؓ کی تصویب میں درجن بھر حدیثیں سننے کے بعد دوسری طرف کے صحابہ کے بارے میں کوئی شخص اچھا گمان کیسے رکھ سکتا ہے۔ ان کے سوال کے مطابق تو ماعز اسلمیؓ، حسانؓ، اثاثہؓ اور حمنہؓ کے بارے میں یا حسنِ ظن کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے یا قذف اور زنا کی شناعت کی نصوص، بالخصوص قذفِ عائشہؓ کے بارے میں آیات کو حذف کر دینا چاہیے۔ اہل السنت کا طرزِ اعتدال یہ ہے کہ فعل کی غلطی اور فاعل پر حکم کو منتھی نہ کیا جائے، کسی کے فعل پر حکم لگانے کے اصول ہیں اور فاعل پر اور۔ اس طرح کے اشکالات کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اہل السنت والجماعت کا پورا نقطۂ نظر سامنے نہیں ہوتا، وگرنہ کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

## عذر کے فہم کے لیے اہم اصول

اوپر تیسرے نمبر پر ہم نے عذر تلاش کرنے کی بات کی، بعض اوقات عذر کی بات بلاوجہ کی تاویل لگ رہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عقلِ عام اور کامن سینس کا ایک اصول بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جس سے مواقف کی غلطی کا عذر سمجھنا مزید آسان ہو جاتا

ہے۔ وہ یہ کہ کوئی خاص واقعہ، خصوصاً گہما گہمی اور جذبات کی حساسیت والا واقعہ ہو رہا ہو، اس وقت کی صورتِ حال اور ہوتی ہے اور بعد میں جب اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو بات اور ہوتی ہے۔ بعد میں جب تجزیہ کیا جارہا ہو تب صحیح معاملے تک رسائی بعض اوقات آسان ہو چکی ہوتی ہے، تاریخ معاملات کو بہت حد تک واضح کر چکی ہوتی ہے، لیکن واقعات ہونے کے دور میں بعض اوقات حالات کی دھول میں بہت سی چیزیں کئی سمجھ دار اور مخلص لوگوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہ جاتی ہیں۔ ماضی میں ہمارے بعض حکم رانوں خصوصا آمروں کے بعض اقدامات کے بارے میں اب تقریباً مسلمہ سا معاملہ ہے کہ وہ غلط تھے، لیکن جب وہ کام ہو رہے تھے تو ہو سکتا ہے ہمیں بعض مخلص ہی نہیں سمجھ دار شخصیات ان اقدامات کے ساتھ کھڑی نظر آئیں۔ آج اگر میں اس معاملے کو درست طریقے سے سمجھ رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ضروری نہیں کہ میری سمجھ بوجھ ان سے بڑھ کر ہے بلکہ عین حالات کے دوران کا اور بعد کا فطری فرق ہے۔ اگر میں اُس طرح کی صورتِ حال میں ہوں تو ممکن ہے میں اس سے بھی بڑی غلطی کر جاؤں۔ اس شخصیت کے اخلاص یا اس کی سمجھ بوجھ پر سوال اٹھانے کی بجائے مجھے چاہیے کہ انہیں اسی صورتِ حال میں رکھ کر دیکھوں اور ان کے موقف کی غلطی کے باجود ان کے عذر کو بھی مدّ نظر رکھوں۔ عہدِ رسالت میں اس کی ایک مثال صلحِ حدیبیہ کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ یہ صلح فرمائی، لیکن صحابہ کے لیے یہ انتہائی حیران کن تھی۔ رسول اللہ ﷺ ہدی ذبح کر کے واپسی کا فرما رہے ہیں لیکن صحابہ کو ایسا کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مشرکین کے مطالبے پر آپ ﷺ حضرت علی کو ڈرافٹ کے ایک لفظ کو مٹانے کا فرما رہے ہیں لیکن ان سے یہ کام نہیں ہو پا رہا۔ سب سے زیادہ جذباتی ہمیں حضرت عمرؓ نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی رسول اللہ ﷺ سے جذباتی انداز میں سوال کر رہے ہیں کہ جب ہم حق پر ہیں وہ باطل پر ہیں تو پھر اپنے دین کے معاملے میں ہم کم زوری کیوں دکھا رہے ہیں، کیا آپ نے خود ہی یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور

طواف کریں گے؟ کبھی اسی انداز سے سوال وجواب اور بحث حضرت ابو بکرؓ سے کررہے ہیں۔ دونوں جگہ سے ایک ہی جواب ملتا ہے(جو رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر میں کمالِ مناسبت کی دلیل بھی ہے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا نصرت جو وعدہ ہے وہ ہر قیمت پر پورا ہو کر رہے گا، آپ اللہ کے نبی ہیں ہمیں ہر قیمت پر ان کا دامن تھامے رکھنا ہے۔[۱۴] اب آج اگر

---

۱۴-**صحیح البخاري**،رقم:۲۷۳۱، کتاب الشروط،باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب۔اس طویل روایت میں متعلقہ لفظ یہ ہیں: فقال عمر بن الخطاب: فأتيت نبي الله صلى الله عليه وسلم فقلت: ألستَ نبي الله حقا، قال: «بلى»، قلتُ: ألسنا على الحق، وعدوُّنا على الباطل، قال: «بلى»، قلت: فلم نُعطي الدنية في ديننا إذا؟ قال: «إني رسول الله، ولستُ أعصيه، وهو ناصري»، قلتُ: أوليس كنتَ تحدثنا أنا سنأتي البيت فنطوف به؟ قال: «بلى، فأخبرتُك أنا نأتيه العام»، قال: قلتُ: لا، قال: «فإنك آتيه ومطوف به»، قال: فأتيت أبا بكر فقلت: يا أبا بكر أليس هذا نبي الله حقا؟ قال: بلى، قلتُ: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: بلى، قلت: فلم نعطي الدنية في ديننا إذا؟ قال: أيها الرجل إنه لرسول الله ، وليس يعصي ربه، وهو

کوئی کہے کہ صلح حدیبیہ کی افادیت اور اس کے نتائج پر میں کئی گھنٹے تقریر کر سکتا ہوں، لہذا میری سمجھ بوجھ اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر اعتماد کی سطح زیادہ ہے تو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ آج اس انداز سے یہ بات کہنا آسان ہے۔ اُس موقع پر اُن حالات میں جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے یہ انھی کا حصہ تھا جنہیں اللہ نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا

---

ناصره، فاستمسِك بغرزه، فوالله إنه على الحق، قلتُ: أليس كان يحدثنا أنا سنأتي البيت ونطوف به؟ قال: بلى، أفأخبرك أنك تأتيه العام؟ قلتُ: لا، قال: فإنك آتيه ومطوف به، – قال الزهري: قال عمر –: فعملت لذلك أعمالا، قال: فلما فرغ من قضية الكتاب، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لأصحابه: «قوموا فانحروا ثم احلقوا»، قال: فوالله ما قام منهم رجل حتى قال ذلك ثلاث مرات، فلما لم يقم منهم أحد دخل على أم سلمة، فذكر لها ما لقي من الناس، فقالت أم سلمة: يا نبي الله، أتحب ذلك، اخرج ثم لا تكلم أحدا منهم كلمة، حتى تنحر بدنك، وتدعو حالقك فيحلقك، فخرج فلم يكلم أحدا منهم حتى فعل ذلك نحر بدنه، ودعا حالقه فحلقه، فلما رأوا ذلك قاموا، فنحروا وجعل بعضهم يحلق بعضا حتى كاد بعضهم يقتل بعضا غما.

تھا۔ مدینے سے اللہ کے نبی کے ایک خواب کی بنیاد پر چلے ہیں۔ منافقین کے طعنوں کو نظر انداز کر کے چلے ہیں۔ راستے میں لبیك اللھم لبیك کی صداؤں اور بیت اللہ کے طواف اور افعالِ عمرہ کے تصور سے جذبات کی سطح کیا ہو رہی ہو گی، اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بہت جوش و جذبے کے ساتھ جان نثاری کی آخری حد تک جانے کی بیعت کر رہے تھے، اب یک دم ایسی یک طرفہ صلح کہ جس فریق کو ہم یقیناً باطل سمجھتے ہیں ان کی ہر بات مانے چلے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ یہیں سے احرام سے ختم کر کے واپسی کا فیصلہ۔ تھوڑی دیر کے لیے خود کو اس خاص ماحول میں تصور کریں، پھر دیکھیں اس صلح کی مستقبل کی افادیت کتنی سمجھ میں آتی ہے۔ آج اس کی افادیت پر گھنٹوں تقریر کر لینا آسان معاملہ ہے۔ لہذا اُس وقت حضرت عمر کو جو تحفظات یا اشکالات تھے اپنی ذات کے اعتبار سے وہ درست نہیں تھے بلکہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر جو فرما رہے تھے وہی درست تھا لیکن اس کی بنیاد پر حضرت عمر کی تنقیص کرنا ہرگز درست نہیں۔ حضرت عمر اس خاص ماحول میں نہ صرف یہ کہ معذور تھے بلکہ ان خیالات کا منشا بھی اچھا ہی تھا۔ اسی طرح صلح سے جن صحابہ میں خستگی پیدا ہوئی اس کا منشا بھی ایمان کی کمی نہیں ایمانی جذبات ہی تھے۔ حضرت عمر کو بعد میں اگرچہ اپنے اس طرزِ عمل پر بہت افسوس ہوا، لیکن یہ ان کی حساس طبیعت اور کمالِ ایمان کی علامت ہے ورنہ ان حالات میں ایسی بات سرزد ہونا کوئی گناہ نہیں تھا۔ اب دونوں طریقے غلط ہوں گے۔ یہ کہنا کہ حضرت عمر کے تحفظات میں جان تو لگ رہی ہے، کل تک جان نثاری کی بیعت اور آج اتنا جھک کر صلح، یہ تو نعوذ باللہ یوٹرن لگ رہا ہے، یہ بھی غلط ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہو گا کہ حضرت عمر کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان میں نعوذ باللہ کمی واقع ہو گئی تھی، یا یہ کہ مجھے اس صلح کی حکمتیں سمجھ میں آ رہی ہیں جو حضرت عمر کو نہیں آ رہی تھیں۔ حاصل یہ کہ کسی معاملے میں کسی کے عذر کو سمجھنے کے لیے اس شخص کو اسی ماحول میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے، اس سے عذر بآسانی

سمجھ میں آجاتا ہے۔

## حضرت علی سے محاربہ کرنے والوں کا مقام

اب یہاں خصوصیت کے ساتھ دو فریقوں پر کسی قدر مستقلا بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک وہ حضرات جو حضرت علیؓ کے مد مقابل آئے اور ان سے حضرت علیؓ کی جنگیں ہوئیں۔ دوسرے وہ حضرات جو حضرت علیؓ کی مدد کے لیے میدان میں نہیں آئے، بلکہ الگ تھلگ رہے۔

حضرت علیؓ کے تین بڑے قتالوں میں سے جنگِ نہروان کے بارے میں تو واضح ہی ہے کہ وہاں مد مقابل خوارج تھے۔ وہاں رسول اللہ ﷺ نے محض ان کے فعل کو غلط یا برا قرار نہیں دیا، بلکہ خود ان لوگوں کو مخلوق میں سے بدترین لوگ قرار دیا ہے۔ جمل اور صفین کے بارے میں کسی قدر بات کرنے کی یہاں ضرورت ہے۔

اس سے پہلے یہ اصول ذہن میں رکھیں کہ کسی کام کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہمیشہ اصولِ شریعت کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دیکھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بعینہ اسی طرح کی صورتِ حال میں اگر کوئی اور یہ کام کرے تو ہم اسے درست کہیں گے یا نہیں۔ اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ مسلمانوں کا ایسا خلیفہ موجود ہے جس کی خلافت منعقد ہو چکی ہے۔ اس کے خلیفہ ہونے یا نہ ہونے پر کوئی سوال موجود نہیں ہے، وہ خلیفہ جائز نہیں عادل ہے، وہ اس منصب کا اہل ہے، اس کی اہلیت پر بھی سوال موجود نہیں ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہل کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ اب کچھ لوگوں کو اس کی کسی پالیسی یا کچھ پالیسیوں سے اختلاف ہو جاتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خلیفہ تو جائز اور عادل ہے لیکن اس کی فلاں پالیسی درست نہیں ہے تو انھیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ خلیفہ سے بات چیت کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بالکل درست طریقہ ہے، وہ اسے نصیحت کرتے ہیں، بہت اچھی بات ہے، وہ اس کی پالیسیوں پر زبان سے تنقید کرتے ہیں، یہ بھی قابلِ

گوارا ہے، وہ کسی قدر احتجاج کر لیتے ہیں، اس پر بھی اعتراض ہیں، لیکن اگر اس سے آگے بڑھ کر خلیفۂ عادل سے اجتہادی اختلاف رکھنے والے اپنا اجتہاد نافذ کرانے کے لیے گروہ اور جتھا بنا لیتے ہیں، تاکہ خلیفۂ وقت کو اپنی بات منوانے پر مجبور کر سکیں، اس مقصد کے لیے خلیفہ کی رِٹ چیلنج کرتے ہیں، کچھ علاقے جو خلافت کا حصہ اور اسی کے ماتحت تھے انھیں خلافت سے الگ کر کے اس پر اپنی متوازی حکومت قائم کر لیتے ہیں، اپنا متوازی لشکر قائم کر لیتے ہیں تو کسی کے نزدیک بھی امامِ عادل سے اپنے مطالبات یا اپنے اجتہادات منانے کا یہ طریقہ درست نہیں ہو گا، خواہ ایسا کرنے والوں کی اجتہادی صلاحیت کتنی بھی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ یہ اصول زید، عمرو، بکر وغیرہ سب کے لیے ہے، چناں چہ خلفائے ثلاثہ کے دور میں بھی اگر کسی بڑے سے بڑے صحابی کا اجتہاد خلیفۂ وقت کے اجتہاد سے مختلف ہوا تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اگر کچھ لوگ اپنے اجتہاد کی تنفیذ کے لیے اس طرح کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو امامِ عادل کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس کے سدّباب کے لیے مناسب کارروائیاں کرے۔ اس مقصد کے لیے اسے فوجی آپریشن یا قتال کا فیصلہ کرنا پڑے تو اسے اس کا بھی اختیار حاصل ہے، جس کی تفصیلات فقہانے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ یہ اصول بہت واضح اور مسلمہ ہو چکا ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت اہل السنت کے نزدیک منعقد ہو چکی ہے۔ وہ خلیفۂ راشد اور امامِ عادل ہیں، اس وقت میں ان سے زیادہ علم اور دینی فضیلت رکھنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں قضا کا سب سے بڑا عالم قرار دے رکھا ہے، جس کا مطلب یہ کہ وہ صرف شرعی اصولوں ہی کو نہیں جانتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کسی خاص امر واقعہ پر منطبق کرنے کا فن بھی سب سے زیادہ جانتے ہیں، حضرت عثمان کی شہادت کیسے اور کن حالات میں ہوئی اسے بھی حضرت علی زیادہ جانتے ہیں (کیونکہ وہ اس پورے معاملے میں مذاکرات اور حضرت عثمان کی جان بچانے کی کوششوں کا حصہ رہے ہیں)۔ قصاصِ عثمان کے

حوالے سے بعض حضرات کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید حضرت علیؓ کی پالیسی درست نہیں ہے، یا اسی سے ملتا جلتا ایک آدھ اشکال اور ہو جاتا ہے۔(یہ چند ایک شبہات بھی قلتِ تأمل یا غلط فہمی پر مبنی ہیں، جو ایک الگ موضوع ہے) یہ حضرت علیؓ کی بہت بڑی کرامت اور آپ کی عظمت ہے کہ آپ کی اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پورا دورِ خلافت پریشانی میں گزرا، بعد میں بھی آپ کو تنقید اور سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا لیکن قصاصِ عثمان جیسے ایک آدھ معاملے کے علاوہ آپ کی گورننس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ سوال یہ نہیں کہ کسے اجتہاد کا حق حاصل تھا کسے نہیں، سوال یہ بھی نہیں کہ کس کا اجتہاد زیادہ وزنی تھا، سوال تو اپنے اجتہاد کی تنفیذ کے طریقہ کار کا ہے۔ بطور مفروضہ مان لیتے ہیں کہ جنھیں یہ شبہ ہوا تھا ان کا مقامِ اجتہاد، حضرتِ علیؓ سے بھی بلند تھا، تب بھی سوال یہ ہے کہ اصول کیا کہتا ہے کہ انھیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ وہی جو اوپر ذکر کیا۔ کسی نے اگر کوئی اجتہادی رائے رکھی ہے تو اس پر تو کوئی اعتراض نہیں نہ ہی حضرت علی نے محض اجتہادی رائے رکھنے کی وجہ سے کسی کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارا موضوع تو حضرت علیؓ ہیں، اس لیے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اگر کسی چیز کی روک تھام کی کارروائی کا فیصلہ کیا تو کیوں کیا؟ کوفے میں خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف بڑی بڑی باتیں کیں، لیکن حضرت علیؓ نے انھیں برداشت کیا، کوئی کارروائی ان کے خلاف نہیں کی۔ یہاں بھی ان حضرات کی طرف سے اپنا متبادل اجتہاد صرف خلیفہ کے سامنے نہیں، سرِ عام بیان کیا جاتا، اپنی دلیل کی روشنی میں خلافت کی پالیسی پر تنقید کی جاتی تو ضرور گوارا کیا جاتا اور کوئی کارروائی نہ ہوتی۔ مگر یہاں اہلِ جمل ہوں یا اہل صفین وہ اپنی بات منوانے کے لیے اس سے آگے نکل جاتے ہیں، اس لیے بقول مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ بالاجماع ان حضرات کا یہ طریقہ خطا پر مبنی تھا اور حضرت علیؓ کا حق پر۔ ایسے موقع پر حضرت علیؓ کو بطور خلیفہ عادل ان تمام کارروائیوں کا اختیار حاصل تھا جو انھوں نے کیں، اور یہی بات احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہوئی کہ حضرت علیؓ کے خلاف کوئی بھی نکلا، اللہ کے نبی

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، ناپسندیدگی کے اظہار کے انداز الگ الگ رہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب نارمل حالت میں ہم کسی معاملے پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو درست رائے اور نتیجے تک پہنچنا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن جہاں حالات انتہائی الجھے ہوئے ہوں، پروپیگنڈے کی گرد میں کچھ دیکھنا مشکل ہو، نت نئی افواہیں ہوں، کچھ لوگوں کا مفاد ہی شخصیات کو ایک دوسرے کے مدمقابل لانے سے وابستہ ہو، ایسے ماحول میں انتہائی فہیم، انتہائی مخلص اور انتہائی دیانت دار شخص کے لیے بھی درست فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر کسی سے درست فیصلہ نہ ہو سکے، تو اس کے عذر اور مجبوری کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

جمل میں حضرت علی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کے مدمقابل حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت ام المؤمنین رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُم نمایاں شخصیات ہیں۔ جمل میں حضرت علی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ صواب پر تھے۔ دوسرے فریق سے اگرچہ غلطی ہوئی ہے، جیسا کہ دلائل اور احادیث سے ثابت ہو چکا کہ غلطی ہوئی ہے اور یہی اہل السنت کا عمومی رخ ہے، مگر ان حضرات کے عذر اور ان کی مجبوری کو سمجھنا اور ان کے دیگر کمالات، مناقب اور کارناموں کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے، اور ان کی نیت پر اعتراض کرنا بھی غلط ہے۔ خصوصاً جنگِ جمل چوں کہ فتنۂ قتلِ عثمان کے جلدی بعد ہوا ہے، اس لیے ان حضرات کا یہ عذر بھی بہت واضح ہے کہ حالات تھے ہی اتنے گرد آلود کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود جنگِ جمل کے واقعات میں بھی بہت ابہامات موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ حضرت زبیر رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، حضرت طلحہ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وغیرہ نے ایک بڑا لشکر جمع کیا تھا، لیکن ان کا پورا پلان کیا تھا؟ شاید اس کا تعین کرنا مشکل ہو۔ اسی طرح حضرت علی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ بھی یہ سوچ کر کہ بجائے اس کے کہ اتنی بڑی جماعت مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کرے اور مدینے کی حرمت دوبارہ پامال ہونے کا امکان پیدا ہو، خود اپنا لشکر لے کر

ان کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اس کے باوجود اس جنگ کو ایک حادثہ کہنا ممکن ہے، اور اس بات کے امکانات موجود تھے کہ فریقین بات چیت سے مسئلہ حل کر لیتے، اس لیے یہاں حالات کے ابہام کا فائدہ بہت واضح انداز میں حضرت زبیر وطلحہ وغیرہ کو دیا جانا ضروری ہے۔

## قتال کا آغاز حضرت علی کے لشکر کی طرف سے نہیں ہوا:

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ان حضرات کی طرف سے عذر کے طور پر جو یہ بات کہی جاتی ہے کہ جنگ حضرت علی کے لشکر میں موجود سبائیوں نے چھیڑ دی تھی کمزور روایت پر مبنی ہے، صحیح یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا دوسری طرف سے ہوئی تھی چنانچہ زید بن وہب بڑے تابعین میں سے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ سے ملاقات کے لیے آرہے تھے کہ راستے میں آپ کی وفات کی اطلاع ملی۔ یہ خود جنگِ جمل شامل تھے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں حضرت علی کے ساتھ نکلنے والوں میں شامل تھا، حضرت علی نے طلحہ اور زبیر سے اپنا ہاتھ روک کر رکھا، یہاں تک کہ دوسرے فریق نے قتال کی ابتدا کی تب حضرت علی نے بھی قتال کیا۔[۱۵] یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے[۱۶] اور اس میں ایک عینی گواہ کی

---

۱۵- مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۳۷۸۳۳، کتاب الجمل: فی مسیر عائشۃ وطلحۃ والزبیر، طحاوی: شرح معانی الآثار حدیث: ۵۱۱۲، کتاب السیر: باب الإمام یرید قتال اہل الحرب الخ۔

۱۶- مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں اس حدیث کے سب سے پہلے راوی ہیں احمد بن عبد اللہ بن یونس، یہ صحاحِ ستہ کے راویوں میں سے، ابن حجر نے انھیں ''ثقۃ حافظ'' کہا ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں زائدۃ بن قدامہ سے، یہ

تصریح ہے کہ قتال کی ابتدا دوسرے لشکر کی طرف سے ہوئی تھی (اس کے خلاف کسی دعوی کے لیے اسی درجے کی روایت درکار ہوگی)، یہ ابتدا کس نے کی ہوگی، یہ الگ معاملہ ہے۔ بظاہر یہ آغاز حضرت طلحہ اور لشکر کے دیگر اکابر کے علم کے بغیر ہوا ہوگا، اس لیے ان حضرات کو اس معاملے میں معذور قرار دیا جانا چاہیے۔

پھر خود جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے رجوع بھی ثابت ہے۔ اس طرح کے الجھے ہوئے حالات میں نیک جذبے کے ساتھ کوئی قدم اٹھانے میں غلطی بھی ہوگئی تو حقیقت کا ادراک ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یاد آنے پر اپنی رائے سے مڑ گئے۔ اس سے بڑھ کر خلوص اور عظمت کیا ہوسکتی ہے؛ اس لیے یہ تو درست ہے کہ اس خاص معاملے میں ان سے فیصلہ غلط ہوا، لیکن اس کی وجہ سے انھیں کسی بھی قسم کی ملامت کا نشانہ بنانا دنیا و آخرت کا خسارہ ہے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ جمل کے بارے میں فرمایا کہ میں اور وہ اس آیت کا مصداق ہوں گے وَنَزَعْنَا مَافِيْ صُدُوْرِهِمْ

---

صحاحِ ستہ کے راوی اور ائمہ میں سے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں کہا ہے: "ثقة، ثبت، صاحب سنة"۔ یہ روایت کرتے ہیں عمرو بن قیس سے، جو بظاہر عمرو بن قیس الملائی ہیں (کیونکہ یہ زید بن وہب سے روایت کر رہے ہیں اور وہ بھی کوفی ہیں یہ بھی کوفی ہیں)، یہ مسلم اور سنن اربعہ کے راوی ہیں، حافظ ابن حجر نے "ثقة، متقن" کہا ہے اور اگر عمرو بن قیس سکونی ہیں تو وہ بھی ثقہ ہیں۔ ان سے اوپر خود زید بن وہب ہیں جو اس واقعے کے عینی شاہد ہیں، انھیں ذہبی نے سیر أعلام النبلاء میں "الإمام الحجة" کہا ہے۔

مِنْ غِلٍّ إِخْوَاناً عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِيْن (اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں ان کے دلوں میں کوئی کدورت ہو گی بھی تو ہم ان کے دلوں سے نکال چکے ہوں گے اور وہ جنت میں بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔) جو روایات ہم نے اپنے اس خطاب میں ذکر کیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں ان کے دل ایک دوسرے کے بارے میں صاف ہو چکے تھے۔

چناں چہ علامہ آلوسی **الأجوبة العراقية** میں مذکورہ روایت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وهذا ونحوه يدل على أنهما - رضي الله تعالى عنهم - لم يذهبا إلا طاهرين مطهرين." (یہ اور اس طرح کی دیگر روایات بتاتی ہیں وہ دونوں [طلحہ و زبیر] دنیا سے پاک صاف ہو کر گئے ہیں۔)[١٧]

حضرت عائشہ کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ دنیا سے حضرت علیؓ کی حقانیت کا اعلان کر کے گئی ہیں۔ نیز علامہ آلوسیؒ اپنے مذکورہ رسالے میں لکھتے ہیں:

> جب حضرت علیؓ کو جنگ میں غلبہ حاصل ہوا تو آپ ام المؤمنین کے پاس تشریف لائے اور کہا: "اللہ آپ کی مغفرت کرے"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا "اور آپ کی بھی؛ میرا مقصد صرف اصلاحِ احوال تھا۔"۔۔۔ تین دن کے بعد دوبارہ حضرت علیؓ ان سے ملاقات کے لیے گئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ کو خوش آمدید کہا اور ان کی بیعت کی۔ اسی دوران میں حضرت علیؓ کو پتا چلا کہ دو

---

١٧- الالوسی، **الأجوبة العراقية**، ٣٦۔

آدمی حضرت عائشہؓ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں تو حضرت علیؓ نے قعقاع بن عمرو کو حکم دیا کہ دونوں کے کپڑے اتار کر انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔۔۔[18]

**اس لیے جمل کے موقع پر اختلاف ضرور ہوا، اور اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں بھی ظاہر ہوا، لیکن یہ اختلاف ان عظیم شخصیات کی زندگی ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ ابتدا میں بعض شخصیات سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے پراسس میں غلطی ہوئی، اب اس پر اعتراض کرنے کی سرے سے کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہی۔**

**علامہ آلوسی نے اپنے مذکورہ رسالے میں اس کے بعد واقعۂ صفین کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ ذکر کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:**

وأهل السنة إلا من شذ يقولون إن عليا كرم الله تعالى وجهه في كل ذلك على الحق لم يفترق عنه قِيد شبر وإن مقاتليه في الوقعتين مخطئون باغون وليسوا كافرين -خلافا للشيعة- ولا فاسقين خلافا للعمريين أصحاب عمرو بن عبيد من المعتزلة ولمن شذ من أهل السنة، ولا أن أحد الفريقين، من علي كرم الله وجهه ومقاتليه، لا بعينه فاسق خلافا للواصلية أصحاب واصل بن عطاء المعتزلي. أما أن الحق مع علي كرم الله وجهه فغني عن البيان. وأما كون المقاتل باغيا فلأن الخروج على الإمام الحق بغي

---

۱۸- نفسِ مرجع، ۳۱۔

وقد صح أنه - صلى الله عليه وسلم - قال: «ويح عمار تقتله الفئة الباغية» وقد قتله عسكر معاوية.[١٩]

سوائے چند شاذ لوگوں کے، باقی اہل السنت کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان تمام [جنگوں] میں حق پر تھے، وہ حق سے ایک بالشت برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے اور یہ کہ دونوں واقعوں [جمل اور صفین] میں حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے غلطی کرنے والے باغی تھے۔ یہ حضرات کافر نہیں تھے، جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں، نہ ہی فاسق تھے جیسا کہ عمرو بن عبید معتزلی کے پیرو کار یا بعض شاذ اہل السنت کہتے ہیں۔ یہ بات بھی [اہل السنت نہیں کہتے] کہ ایک فریق متعین یا غیر متعین طور پر فاسق تھا جیسا کہ واصل بن عطاء معتزلی کے پیرو کار کہتے ہیں [یعنی اہل السنت کے نزدیک کسی بھی فریق کو متعین طور پر یا غیر متعین طور پر فاسق کہنا درست نہیں]۔ جہاں تک [اہل السنت کے مذہب کے پہلے حصے کا] تعلق ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا تو [یہ اتنا واضح ہے کہ] اسے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ آپ سے قتال کرنے والا باغی تھا تو اس وجہ سے کہ امام برحق کے خلاف خروج کرنا بغاوت ہے اور یہ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی اور حضرت عمار کو حضرت معاویہ کے لشکر نے قتل کیا۔

## محض بغاوت کی وجہ سے کفر، فسق یا لعنت کا اطلاق درست نہیں

اس کے بعد علامہ آلوسیؒ نے الفئۃ الباغیۃ والی حدیث میں کی جانے والی تاویلوں کی

---

١٩ - نفسِ مرجع، ٣٨۔

تردید کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ بغاوت کی وجہ سے کسی کا کفر ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے پہلی دلیل سورۂ حجرات کی آیت ہے، جس میں جہاں الفئۃ الباغیۃ کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا ہے، وہیں دونوں جماعتوں کو مؤمن قرار دیا گیا ہے۔ ایک مضبوط دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ مقابل فریق کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ درمیان میں انھوں نے شیعوں کے متعدد اعتراضات کے جواب دیے ہیں، اس کے بعد ایک واقعے سے علامہ الوسیؒ نے استدلال کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بھی حضرت علیؓ سے قتال اور بغاوت پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔ غالباً اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اہل صفین پر بھی فاسق کا اطلاق درست نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کسی کو فاسق کہتا ہے دلیل اس کے ذمے ہوتی ہے، لہذا یہاں بھی مدعی کے ذمے دلیل ہوگی کہ باغی فاسق بھی ہوتا ہے، جب کہ ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے فسق کی نفی اور انداز سے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> اب رہا یہ شک کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کردار باغیانہ تھا[۲۰] اور وہ ناحق غلبہ حاصل کرنے والے تھے تو [اہل السنت] ان پر لعن کیوں نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب پر

---

۲۰- کردار باغیانہ تھا یہ اردو مترجم کا ترجمہ ہے اصل فارسی عبارت یہ ہے "آمدیم باین کہ چوں اورا باغی ومتغلب می دانند پس چرا لعنِ او نمی کنند"، یعنی اب اہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ جب اہل السنت حضرت معاویہ کو باغی ومتغلب سمجھتے ہیں تو ان پر لعنت کیوں نہیں کرتے۔"

لعن جائز نہیں اور چوں کہ بغاوت بھی کبیرہ گناہ ہے، اس لیے اس پر لعن منع اور ناجائز ہے۔[21]

لیکن میرے نزدیک یہ مقدمہ ہی محلِّ نظر ہے کہ ہر بغاوت کبیرہ گناہ ہوتی ہے، یا کسی بھی کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے آدمی مطلقاً فاسق ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تفصیل میں جانے سے بات دوسری طرف نکل جائے گی، لیکن ایک بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ باغی اگرچہ غلطی پر ہو اس کے پاس تأویل ہوتی ہے، اور تاویل چاہے بذاتِ خود غلط ہو، لیکن اس کے نتیجے میں متعدد احکام میں تخفیف ضرور ہوتی ہے، حتی کہ کفر جیسے حکم میں بھی تاویل سے تخفیف ہو جاتی ہے؛ اس لیے کہ فقہا کی ذکر کردہ تفصیل کے مطابق اگر کچھ لوگ جتھا بنا کر امام برحق کی طاعت سے نکل جائیں اور کسی جگہ پر اپنی عمل داری قائم کر لیں تو اگر تو ان کی کوئی تاویل نہیں ہے تو وہ لصوص اور قطاع الطریق یعنی ڈاکو اور خالص مفسدین فی الارض کہلائیں گے، اگر ان کی تاویل ہے تو اگر اپنے علاوہ کو کافر بھی کہتے ہیں تو وہ خوارج ہیں اور اگر اپنے علاوہ کو کافر نہیں کہتے، تاہم تاویل رکھتے ہیں یعنی ایسی وجہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں (اگرچہ امرِ واقعہ میں ان کا ایسا سمجھنا درست نہ ہو) تو وہ باغی کہلائیں گے۔[22]

---

۲۱- شاہ عبد العزیز، **تحفہ اثنا عشریہ** (اردو)، ۳۶۰۔

۲۲- چناں چہ ابن عابدین کے **الدر المختار** پر حاشیہ **رد المحتار** میں ہے:

(قوله: وبغاة) هم كما في الفتح قوم مسلمون خرجوا على إمام العدل ولم يستبيحوا ما استباحه الخوارج من دماء المسلمين وسبي ذراريهم اهـ والمراد خرجوا بتأويل وإلا فهم قطاع كما

اس سے معلوم ہوا کہ امامِ عادل کی طاعت سے جتھا بنا کر نکلنے کی صورتوں میں سے شناعت میں سب سے کم صورت بغاوت کی ہے۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے جنگ کے بیش تر ظاہری احکام خوارج اور بغاۃ پر ایک جیسے لاگو کیے اور حضرت علیؓ کو فقہانے اس باب میں اسوہ قرار دیا ہے، لیکن نصوصِ نبویہ اور خود حضرت علیؓ کے ارشادات کی روشنی میں دیکھیں تو خوارج کے لیے جس طرح کے سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ بغاۃ کے لیے استعمال نہیں ہوئے، بلکہ حضرت علیؓ نے دونوں طرف کے مقتولین کو جنتی قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لصوص کو بھی فاسق ہی کہہ سکتے ہیں کافر نہیں، خوارج بھی راجح قول کے مطابق فاسق ہی ہیں کافر نہیں، تو باغی جس کی شناعت ان دونوں سے کم ہے، اس پر بھی فاسق کا اطلاق کریں گے تو فرق کیا رہ جائے گا؟ اس لیے مجھ ناچیز کی رائے میں ہر باغی پر فاسق کے اطلاق کا اصول ہی محلِ نظر ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مدمقابل فریق کے مجتہد ہونے سے یہاں امام کے لیے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی دوسری طرف کے حضرات نے اجتہاد کیا تھا اس سے حضرت علی کی پوزیشن اور ان کے اقدام کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ یہاں عام طور پر جس کو اجتہاد کہا جاتا ہے اس کے لیے ٹھیٹھ فقہی اصطلاح "تاویل" ہے۔ اور تاویل کی موجودگی بغاوت کے تحقق میں مانع نہیں ہوتی، بلکہ حنفیہ کی اصطلاح کے مطابق

---

علمت. وفي الاختيار: أهل البغْي كل فئة لهم منعة يتغلبون ويجتمعون ويقاتلون أهل العدْل بتأويل يقولون: الحق معنا ويدعون الولاية. اهـ.(*ابن عابدین محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین*، **رد المحتار علی الدر المختار** (بیروت: دار الفکر، ۱۹۹۲ء)، ۴: ۲۶۲۔

باغی بنتا ہی تاویل (اجتہاد) سے ہے۔ نیز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ اجتہاد کرنے کا نہیں ہے، اپنے اجتہاد پر عمل کرانے کے لیے اس طرح سے نکل پڑنے کا یا یہ طریقہ اختیار کرنے کا ہے۔

نیز یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضرت معاویہؓ کی جماعت پر بغاۃ والا حکم تب تک تھا، جب تک حضرت حسنؓ نے ان سے صلح نہیں کی تھی۔ صلح کے بعد حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے جائز حکم ران بن گئے؛ اس لیے اب ان پر بغاوت کا اطلاق نہیں ہو گا۔ چناں چہ شاہ عبد العزیزؒ لکھتے ہیں:

> یہاں پر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بعض جاہل امامیہ انتہائی عناد و تعصب کی بنا پر کہتے ہیں کہ اہلِ سنت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں۔ یہ قول انتہائی بے شرمی اور شوخ چشمی پر مبنی ہے اور اس کو منہ پر جھوٹ بولنا کہتے ہیں۔ ورنہ معمولی پڑھا لکھا فارسی خواں[۲۳] جس نے اہل سنت کے مولانا عبد الرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ عقائد نامہ فارسی پڑھا یا دیکھا ہے، یقین سے جانتا ہے کہ اہل سنت سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ابتداے امامت سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے معاملۂ امامت حوالہ کرنے تک، حق پر نہیں تھے، بلکہ باغی جیسا

---

۲۳- اس زمانے میں ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگ عموماً فارسی پڑھنے والے ہوتے تھے، خود **تحفہ اثنا عشریہ** بھی فارسی میں ہے، بظاہر لگتا ہے کہ مولانا جامی کی کتاب اس زمانے میں متداول ہو گی، اس لیے اس کا حوالہ دیا کہ شیعوں کا یہ اعتراض ایک متداول و معروف کتاب کے بھی خلاف ہے۔

کردار ادا کر رہے تھے [یہ مترجم کا تصرف ہے، صحیح ترجمہ ہے کہ "باغی تھے" تفصیل حاشیے میں۔ اس لیے کہ امام وقت کی اطاعت چھوڑ بیٹھے تھے، امام حسن رضی اللہ عنہ نے جب امامت سپرد کی تو اس وقت وہ بادشاہ ہوئے۔ (۲۴)

حاصل یہ کہ حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے تمام گروہ غلطی پر تھے، لیکن اہلِ جمل و صفین کو فاسق کہنا درست نہیں، ان پر لعن طعن اور سب و شتم کرنا جائز نہیں، ایک خاص معاملے میں جتنی غلطی ان سے ہوئی ہے اس کے بیان سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔

بہر حال ہماری گفت گو کا اصل موضوع اہل جمل و صفین نہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت احادیث نبویہ کی روشنی میں ہے۔ احادیث سے یہ بات ثابت کی جاچکی

---

۲۴ - شاہ عبدالعزیز، مرجعِ سابق، ۳۶۰۔ باغی کے ساتھ "جیسا" کا لفظ مترجم نے زائد کر دیا ہے اصل فارسی میں شاہ صاحب کی تعبیر یوں ہے: "اہل سنت قاطبۃ اجماع دارند بر آن کہ معاویہ بن ابی سفیان از ابتدا ی امامت حضرت امیر بغایت تفویض حضرت امام حسن باو از بغاۃ بود کہ اطاعت امام وقت نداشت ، وبعد از تفویض حضرت امام بدو از ملوک شد." یعنی تمام اہل السنت کا اجماع ہے کہ حضرت حسن کی تفویض تک معاویہ بن ابی سفیان باغیوں میں سے تھے۔

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داخلی قتالوں کی تصویب فرمارہے ہیں بلکہ ان کی بعض جگہ تحسین بھی فرمارہے ہیں؛ اس لیے داخلی جنگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عیب اور نقص شمار کرنا درست نہیں ہے۔

## متخلفین کا نقطۂ نظر

اب تھوڑی سی بات ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی مناسب معلوم ہوتی ہے، جو کسی طرف سے بھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ جو لوگ کسی طرف سے بھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، ان کا معاملہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے مقابلے میں بہت اہون ہے جو آپ کے مقابلے میں بر سرِ پیکار تھے؛ کیوں کہ ان کی اگر کوئی کوتاہی فرض کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ امامِ عادل کی نصرت سے وہ محروم رہے۔ جب ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مقاتلین کو برا بھلا کہنا درست نہیں، تو یہ حضرات تو بالکل ہی قابلِ ملامت نہیں ٹھہرتے؛ کیوں کہ کفار کے خلاف بھی جہاد فرضِ عین تب ہوتا ہے، جب کہ یا تو امام نفیرِ عام کر دے یا کسی کو متعین طور پر جانے کا حکم دے دے۔ اہل بغی کے قتال میں بطریقِ اولی یہ بات ہو گی۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کو بطور حکمِ امیر المؤمنین متعین طور پر قتال میں شریک ہونے کا پابند کیا ہو یا عمومی حکم جاری کیا ہو کہ سب کا نکلنا ضروری ہے۔ آپ نے افراد سے جو بات کی وہ بھی عموماً ترغیب ہی کے انداز میں تھی، اور عمومی خطابات بھی اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ اس لیے ان میں سے اکثر پر اعتراض سرے سے بنتا ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم کس کس کے کیا اعذار ہوں گے! البتہ بعض حضرات کا پیچھے رہنا بطور رائے تھا۔ بعض کی رائے ہو سکتا ہے کہ پالیسی کی نوعیت کی ہو۔ یعنی جب بغاوت کی شرائط متحقق ہو جائیں تو امامِ عادل کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے اور ازالۂ

شبہات کی کوشش کے بعد قتال کا فیصلہ کرے، لیکن وہ حتمی طور پر قتال کا پابند نہیں ہو جاتا، بلکہ اس نے حالات وواقعات دیکھ کر فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ قتال کرنا بہتر پالیسی ہوگی یا نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے کچھ حضرات کا یہ خیال ہو کہ اگرچہ مخالف فریق کا طرزِ عمل درست نہیں ہے، اس کے باوجود ان سے قتال کے بجاے کوئی اور پالیسی اختیار کرنا بہت زیادہ بہتر ہوگا۔ اس رائے کا براہِ راست حکمِ شریعت سے تعلق نہیں ہے، اس لیے یہاں اس پر بات کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کے سیاسی مضمرات وغیرہ یہ الگ موضوعِ بحث ہے؛ تاہم قتال سے پیچھے رہنے والے حضرات میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو باقاعدہ اپنی ایک خاص رائے کے تحت قتال سے پیچھے رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ترغیب کے باوجود انھوں نے اپنی اس رائے کی بنیاد پر معذرت کرلی۔ ان حضرات کی رائے میں چوں کہ نصوص کا حوالہ اور شرعی پہلو بھی آتا ہے؛ اس لیے ان کے موقف کو ذرا سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے بھی کہ آج کل بعض لوگ ان کی رائے کی بطور خاص بڑی تمجید کرتے ہیں کہ دیکھیں جی، یہ سارا ماحول دنگے فساد کا تھا، اس لیے بڑے بڑے صحابہ نے خود کو اس لیے الگ رکھا، سب سے بہتر دانش مندانہ انداز انھی کا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ جو قتال کرتے پھر رہے تھے، وہ بس ویسے ہی لگے ہوئے تھے (بلکہ سبائیوں کے بہکاوے میں آئے ہوے تھے یا ان کے ہاتھوں مجبور تھے)۔ گویا براہِ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات کی تنقیص تو مشکل ہے، یہ کام بالواسطہ طریقے سے کرو۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کا تعلق ہے تو اس کا انکار تو خود مقاتلین سے ثابت نہیں، تو توقف کرنے والوں کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے منکر تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ معلوم کتنے حضرات تو ذاتی

اعذار کی وجہ سے قتال کا حصہ نہیں بنے ہوں گے،[۲۵] یا بالتعیین تشکیل نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ضروری نہیں سمجھا ہو گا؛ تاہم متوقفینِ صحابہ کی ایک جماعت کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی مسلمان گروہ کے لیے کسی بھی حالت میں کسی دوسرے مسلمان گروہ کے خلاف قتال کرنا جائز نہیں ہے اور اگر دو مسلمان گروہوں کے درمیان قتال ہو رہا ہو تو کسی بھی حالت میں ان میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت میں قتال میں حصہ لینا جائز نہیں ہے۔ ان حضرات کا مستدل ان احادیث کا عموم تھا جن میں دورِ فتن میں قتال سے الگ تھلگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے یا مسلمانوں کی باہمی جنگ کی مذمت بیان کی گئی ہے۔[۲۶] مثلاً حضرت ابو بکرہ

---

۲۵۔ بعض فقہاے حنفیہ نے سب متخلفین کے تخلف کو عدمِ قدرت پر محمول کیا ہے، چناں چہ سرخسی لکھتے ہیں: والذي روي أن ابن عمر - رضي الله عنهما - وغيره لزم بيتَه ، تأويلُه أنه لم يكن له طاقة على القتال، وهو فرض على من يطيقه، بہت سے صحابہ کے بارے میں یہ وجہ بھی درست ہے، لیکن سب پر اس کا اطلاق بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔ صحیح تعبیر عذر کی ہے، یعنی وہ عذر کی وجہ سے پیچھے رہے۔ من جملہ دیگر اعذار کے ایک عذر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں قتال کی راے سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ دوسری طرف بھی مسلمان ہیں۔

۲۶- ان حضرات کی یہ بات کہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کا انکار نہیں کر رہے، اپنی اس خاص راے کی وجہ سے قتال میں شرکت سے معذرت کر رہے ہیں، خود ان اہلِ توقف کی روایات سے واضح ہے۔ اس کے علاوہ ابن العربی بھی لکھتے

ہیں:قالت العثمانية: تخلف عنه من الصحابة جماعة، منهم سعد بن أبي وقاص ومحمد بن مسلمة، وابن عمر، وأسامة بن زيد وسواهم من نظرائهم.قلنا: أما بيعته فلم يتخلف عنها. وأما نصرته فتخلف عنها قوم منهم من ذكرتم. (*ابو بکر ابن العربی*، **العوام من القواصم**(بیروت: دارالجیل، ۱۹۸۷ء)، ۱۵۰۔؛*اسی طرح قاضی ابو بکر باقلانی بڑی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ ان اہلِ تخلف نے کیا دلیل پیش کی، ساتھ ہی اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ امام نہیں ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں:* قيل لهم ليس في جميع القاعدين ممن أسميناه أو أضربنا عن ذكره مَن طعَنَ في إمامته واعتقدَ فسادَها ، وإنما قعدوا عن نصرته على حرب المسلمين لتخوفهم من ذلك وتجنب الإثم فيه، وظنِّهم موافقة العصيان في طاعته في هذا الفعل؛ فلذلك احتجوا عليه في القعود ورووا له فيه الأخبار، وقال منهم قائل: لا أقاتل حتى تأتيني بسيف له لسانٌ يعرف المؤمن من الكافر، ويقول هذا مؤمن وهذا كافر فاقتله ، ولم يقل إنك لست بإمام واجب الطاعة وقال له محمد بن مسلمة بعد مراجعته ومعارضته: إن رسول الله ﷺ

رضی اللہ عنہ قتال سے اس لیے الگ رہے، بلکہ **صحیح بخاری** کی روایت کے مطابق احنف بن قیس کو بھی قتال میں شریک ہونے سے اس لیے روکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مد مقابل ہوں تو قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں دوزخی ہیں۔ اس طرح کی بھی متعدد روایات ہیں کہ خود حضرت علیؓ کے سامنے بعض صحابہ نے لڑائی میں عدمِ شرکت کا یہ عذر پیش کیا کہ مدّ مقابل فریق بھی مسلمان ہے، اور فتنہ میں ترکِ قتال اور الگ تھلگ رہنے کی کوئی حدیث پیش کی، کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حالات میں لکڑی کی تلوار بنانے کا حکم دیا تھا، چناں چہ میں نے لکڑی کی تلوار بنالی ہے۔ کسی نے لڑائی سے شرکت کرنے سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

عهد إلي إذا وقعت فتنة بين المسلمين أن أكسر سيفي وأتخذ مكانه سيفا من خشب وفي خبر آخر أن أغمد سيفي وأمتسك في بيتي حتى تأتيني ميتة ماضية أو يد خاطئة ، فاحذر يا علي لا تكن أنت تلك اليد الخاطئة ، ولم يقل له: لستَ بإمام مفروض الطاعة وكذلك قال له أسامة بن زيد: قد علمتَ يا علي أنك لو دخلتَ بطن أسد لدخلتُ معك فيه ولكن لامواساة في النار ، ولم يقل إنك لست بإمام وإنما خاف من قتل المسلمين ، وليس هذا من القدح في الإمامة بسبيل. (ابو بکر الباقلانی، **تمهيد الأوائل في تلخيص الدلائل**، ۵۵۴۔)

ہے کہ قتال تب تک کرنا ہے، جب تک لوگ کلمہ نہ پڑھ لیں، جب کلمہ پڑھ لیں تو قتال نہیں کیا جائے گا۔ یعنی یہاں مدِ مقابل چوں کہ کلمہ گو ہیں اس لیے قتال نہیں کریں گے۔ اس طرح کے مکالمات سے اتنی بات تو واضح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان نصوص کو جس موقع پر فٹ کر رہے ہیں، اس موقع کے بارے میں یہ نصوص نہیں ہیں۔ وگرنہ تو نص سن کر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کی بات کے قائل ہو جاتے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ایسی نصوص موجود ہیں جن میں مسلمانوں کے باہمی قتال میں شرکت سے منع کیا گیا ہے، لیکن جس طرح سے ان حضرات نے ان نصوص کو عام سمجھا ہے، بعد میں اس تشریح کا کوئی بھی قائل نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان استدلالات کو مان لینے سے بعض ایسے محذورات لازم آتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی شاید ان کا قائل نہیں ہو گا۔ مثلاً حضرت ابو بکرہؓ نے جس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے احنف بن قیس کو قتال میں حصہ لینے سے منع کیا ہے، اسے اگر مان لیا جائے تو مطلب یہ بنے گا کہ اس جنگ میں دونوں طرف سے شریک ہونے والے خواہ وہ مقتول ہوں یا قاتل دوزخی ہیں، جب کہ دنیا میں کوئی بھی مسلمان اب ایسا نہیں ہو گا کہ جو اس بات کا قائل ہو کہ جمل و صفین کے سارے شرکا اور تمام مقتولین نعوذ باللہ دوزخی تھے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فریقین کے مرنے والوں کو جنتی قرار دیا۔ یہی حال باقی نصوص کا ہے، ان کے اپنے محامل ہیں، جس کی تفصیل کی طرف جانے سے بات دوسری طرف نکل جائے گی؛ چناں چہ اس بات پر کم از کم اہل السنت کا اتفاق موجود ہے اور کوئی اختلاف کہیں نظر نہیں آتا کہ اگر امام عادل موجود ہو اور کچھ لوگ اس کی طاعت سے نکل جائیں اور باغی کی شرائط متحقق ہو جائیں تو امام کو ان کے مسلمان ہونے کے باوجود ان کے خلاف قتال کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے اور اگر امام ایسا فیصلہ کرے تو اصل حکمِ شرعی یہی ہے کہ اس کے کہنے سے باغی گروہ کے خلاف قتال کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن نصوص کو ان بعض صحابہ نے قتال سے عذر کے طور پر پیش کیا، ان کے بارے میں اتنی بات

پر تو اتفاق ہو گیا ہے کہ یہ خاص صورت ان احادیث کے تحت داخل ہی نہیں ہے، اور اس حد تک ان احادیث میں تخصیص اتفاقی ہو چکی ہے۔ ویسے بھی ان حدیثوں کو اگر اپنے عموم پر لیں تو یہ نص قرآنی کے خلاف ہو جاتی ہیں؛ اس لیے کہ قرآن جن کے بارے میں کہہ رہا ہے فقاتلوا التي تبغي یہ مؤمنین ہی کا ایک طائفہ ہے، لہٰذا "بغی" کے پائے جانے کی صورت میں کسی مسلمان گروہ سے قتال کرنا خود نص قرآنی سے ثابت ہے؛ اس لیے صحیح یہی ہے کہ چوں کہ اس خاص وقت میں حالات میں الجھاؤ بہت زیادہ تھا، اس طرح کی صورتِ حال سے پہلی دفعہ واسطہ پڑ رہا تھا، اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کے خلاف قتال ایک تکلیف دہ امر ضرور ہے، جس کا سب سے زیادہ اظہار خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتالِ بغاۃ میں نپے تلے انداز سے ہوتا ہے؛ اس لیے فوری طور پر یا غلبۂ حال میں تمام نصوص کی طرف توجہ نہ جانے کی وجہ سے ان چند حضرات سے ان نصوص کے فہم میں غلطی ہوئی اور ان نصوص کو عموم پر محمول نہ کرنے پر بعد کے ادوار میں اتفاق ہو گیا ہے، بلکہ خود قرن اول میں بھی، بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، جمہور کی رائے یہی تھی کہ یہ حدیثیں اپنے عموم پر محمول نہیں۔[۲۷]

---

۲۷- چناں چہ حافظ فرماتے ہیں: واحتج به من لم ير القتال في الفتنة وهم كل من ترك القتال مع علي في حروبه كسعد بن أبي وقاص وعبد الله بن عمر ومحمد بن مسلمة وأبي بكرة وغيرهم وقالوا يجب الكف حتى لو أراد أحد قتله لم يدفعه عن نفسه ومنهم من قال لا يدخل في الفتنة فإن أراد أحد قتله دفع عن نفسه وذهب جمهور الصحابة والتابعين إلى وجوب نصر الحق

چوں کہ ان حضرات نے احادیث کا یہ مفہوم سمجھ کر اگرچہ غلطی کی، لیکن نیک نیتی سے رائے قائم کرنے کی کوشش کی، اس لیے وہ قابلِ طعن وملامت بھی نہیں، اور حالات کی گرد بیٹھنے کے بعد ان کی رائے کو اختیار کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ اگر یہ بات درست ہے، اور یقینا درست ہے کہ یہ حدیثیں اپنے عموم پر محمول نہیں اور مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی باہمی قتال ایسا ضرور ہے جو مستثنیٰ اور جائز ہے، تو اس کا سب سے زیادہ حق دار خلیفہء راشد کا قتال ہو گا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتال اس میں داخل نہیں تو بعد میں کسی اور کا باغیوں کے خلاف قتال کرنا بھی اس میں داخل نہیں ہونا چاہیے اور ان تمام قتالوں پر وہی مذکورہ استدلال لاگو کر کے ان سے پیچھے رہنے والوں کی تمجید کرنی چاہیے، بلکہ فقہ کی کتابوں سے أحکام البغاة کا باب ہی نکال دینا چاہیے۔ حیرت کی بات ہے کہ سید احمد شہیدؒ سکھوں کے علاوہ مسلمانوں سے بھی قتال کریں، ملا عمر اپنے مخالف مسلمانوں کے خلاف قتال کریں تو اس سے اختلاف کرنے والوں کی تمجید تو نہ کی جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کے بارے میں اسی مرجوح استدلال کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے جو ہر اس جائز اور نیک سے نیک حکم ران کے خلاف پیش ہو سکتا ہے جو اپنی حکومت کی رِٹ منوانے کے لیے کسی بھی درجے میں طاقت کا استعمال کرے۔ جیسا کہ ہم نے اس بحث کے شروع میں عرض کیا، کسی موقف کی درستی کو جانچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اب اگر اسی طرح کی صورتِ حال ہوتی ہے تو اس موقف سے استدلال کتنا وزنی ہو گا۔ فرض کر لیں آپ کو یا آپ کی کسی محبوب ترین ہستی کو جو علم، تقوی

---

وقتال الباغين وحمل هؤلاء الأحاديث الواردة في ذلك على من ضعف عن القتال أو قصر نظره عن معرفة صاحب الحق. (ابنِ حجر، فتح الباري، ۱۳: ۳۴۔)

دیانت وغیرہ ہر اعتبار سے بہت اونچے مرتبے پر فائز ہیں، انھیں امیر المؤمنین بنا دیا جاتا ہے، بالکل جائز طریقے سے، اس وقت کے مروجہ دستور کے بالکل مطابق۔ اب کچھ لوگ ان امیر المؤمنین کے خلاف باقاعدہ لشکر تشکیل دے کر ان کی رٹ کو چیلنج کر دیتے ہیں اور آپ کے وہ امیر المؤمنین آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نپا تُلا ہی سہی، طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ ایسے میں کچھ دانش مند اسی طرح کے استدلالات لے کر آپ کے امیر المؤمنین کی پولیس اور فوج کے افسران کے پاس پہنچ جاتے ہیں، جی دیکھیں آپس کی لڑائی بھڑائی اچھی بات نہیں ہوتی، صلح صفائی سے مسئلے حل ہونے چاہییں، بس جاؤ سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھو، اپنی بندوقوں کو کند کر دو، اپنے ذہن سے لڑائی کا خیال نکال دو۔ ایسے دانش مندوں کے بارے میں صرف یہ کہنے کے بجاے کہ مخلص اور نیک نیت ہونے کی باوجود چوں کہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پاے اس لیے معذور ہیں، اس کے بجاے ان حالات میں ان ''دانش مندوں'' کے موقف کی تمجید کی جائے اور کہا جائے کہ کرنے کی بات تو انھوں نے ہی کی ہے، یہ ہیں صحیح صلح پسند لوگ، تو سوال یہ ہے کہ آج اگر اس طرح کی صورتِ حال ہو، اور آپ کے کسی محبوب امیر المؤمنین کے برعکس اس موقف کو اس طرح تمجید کے ساتھ پیش کیا جائے تو آپ کے خیال میں کتنا درست ہو گا، اور دنیا کا کون سا فقیہ اس اندازِ فکر کو درست قرار دے گا؟[۲۸]

اس طرح کے موقف کو درست مان لینے اور ان نصوص کو عموم پر محمول کرنے کا

---

۲۸ - اور اب حالیہ دنوں میں تو ''پیغامِ پاکستان'' وغیرہ کے نام سے تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ اور جلیل القدر علما کی طرف سے جدید مسلم ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے خلاف بھی فوجی اقدام کی حمایت کی گئی ہے۔ متوقفین کا بیانیہ مان لیا جائے تو یہ بیانیہ بھی غلط ٹھہرے گا۔

عملی نتیجہ کیا ہو گا؟ اسی کو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، ابن جریر طبریؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال الطبري لو كان الواجب في كل اختلاف يقع بين المسلمين الهرب منه بلزوم المنازل وكسر السيوف لما أقيم حد ولا أبطل باطل ولوجد أهل الفسوق سبيلا إلى ارتكاب المحرمات من أخذ الأموال وسفك الدماء وسبي الحريم بأن يحاربوهم ويكف المسلمون أيديهم عنهم بأن يقولوا هذه فتنة وقد نهينا عن القتال فيها وهذا مخالف للأمر بالأخذ على أيدي السفهاء. (۲۹)

طبری کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں اگر اس بات کو واجب قرار دے دیا جائے کہ گھروں میں بیٹھ کر اور تلواریں توڑ کر اس اختلاف سے راہِ فرار اختیار کی جائے [جیسا کہ بعض نے سمجھا] تو کوئی حد قائم نہ ہو سکے، کسی باطل کو ختم نہ کیا جا سکے اور اہل فسق مال لوٹنے، خون بہانے اور عزتیں لوٹنے جیسے محرمات کا کھلا راستہ پالیں، اس طرح سے کہ وہ

---

۲۹- ابنِ حجر، فتح الباري، ۱۳: ۳۴۔

تو مسلمانوں سے بر سرِ پیکار ہوں گے اور مسلمان اپنے ہاتھ روک لیں گے کہ [ چوں کہ دوسرا فریق بھی مسلمان ہے اس لیے ] یہ ''فتنہ'' ہے اور ہمیں فتنے میں قتال سے منع کیا گیا ہے۔

پھر خوارج کے خلاف قتال کے بارے میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ مہربان متجددین بھی مانتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ کارنامہ ہے، حالاں کہ متوقفین صحابہ کا مذکورہ بالا استدلال تو اس کے بھی خلاف جاتا ہے، اس لیے کہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو کافر قرار دیا ہو، بلکہ اس کے برعکس عدمِ تکفیر کے اقوال ملتے ہیں۔[۳۰] اس لیے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں قتال کرنے والوں کو معذور سمجھ کر ان پر طعن سے گریز کیا جاتا ہے، ان کے موقف کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں تمجید نہیں کی جاتی، یہی معاملہ اہلِ توقف کا بھی ہے۔ توقف کی اس رائے کی تمجید کرنے والے تاثر تو یہ دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ عظمتِ صحابہ کا فرض انجام دے رہے ہیں، لیکن حقیقت میں صحابہ کے دو بڑے فریقوں کو بیک وقت مطعون کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ اتنی بڑی دانش مندی سے محروم

---

۳۰- اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کے فیصلوں میں کیڑے نکالنے والے یہی لوگ خاندان بنو امیہ کے متعدد حکم رانوں کے کارناموں میں یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے فلاں فلاں موقع پر خوارج سے لڑائی کی اور بغاوت کو بزورِ طاقت فرو کیا، یہاں آکر یہ استدلالات ان کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ کیا اس دور تک وہ تلواریں ایجاد ہو چکیں تھیں جو مسلم و غیر مسلم کے درمیان تفریق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی یا اب یہ صحابہ کے اقوال نہیں رہے تھے کسی اور کے بن گئے تھے؟

ہی رہے۔ یہ دیکھیں کتنی خوب صورت صلح صفائی کی باتیں کر رہے تھے، لیکن ان دونوں فریقوں کو نعوذ باللہ سمجھ نہیں آئیں۔ جس طرح سے یہ صحابہ غلبۂ احتیاط کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف قتال سے ہچکچاہٹ کا شکار تھے، اس سے اللہ تعالی کی یہ تکوینی حکمت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اللہ تعالی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر شخصیت اور خلیفۂ راشد سے قتالِ بغاۃ کا نمونہ قائم نہ کروا دیا ہوتا، تو بہت سے نیک طبیعت لوگوں کے لیے اس مسئلے کو مسئلہ شرعیہ سمجھنا ہی مشکل ہو جاتا، کوئی بھی حکومت کسی بھی حالت میں اندورنی طور پر طاقت کا استعمال نہ کر پاتی یا کم از کم اس کا شمار بھی خاصے اختلافی مسائل میں ہوتا۔

پھر متخلفین کی یہ آرا کب تک باقی رہیں؟ یہ الگ سوال ہے؛ اس لیے کہ تین واقعے بعد میں ایسے پیش آئے جو بہت سوں کی رائے میں تبدیلی پیدا ہونے کا ذریعہ بن سکتے ہیں: ایک تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت، جس پر تفصیل سے بات ہو چکی؛ چناں چہ حضرت خزیمۃ بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے قتال کے معاملے میں متردد تھے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھوں نے قتال میں حصہ بھی لیا اور شہید بھی ہوئے۔ دوسرا بڑا واقعہ قتالِ خوارج کا خاص معرکہ ہے جس میں ذو الثدیہ مارا گیا تھا۔ ان سے قتال کرنے والی جماعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت اچھے الفاظ منقول ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برحق ہونے کی دلیل سمجھا۔ تیسرے بعد میں پیش آنے والے یزید کے اور خاندانِ مروان کے کرتوت؛ چناں چہ متخلفین میں ایک بڑا نام، بلکہ جنھیں رئیس المتخلفین کہا جا سکتا ہے، وہ ابن عمرؓ ہیں؛ ان کے بارے میں بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ انھیں بھی بعد میں افسوس ہی رہا کہ میں نے الفئۃ الباغیۃ کے خلاف قتال کیوں نہ کیا۔ جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں جانے والی ہر روایت میں تاویل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، ان کی اس تاویل پر بھی بات ہو چکی ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات پر افسوس تھا کہ حجاج بن یوسف کے ساتھ مل کر حضرت عبد اللہ بن زبیر کے خلاف "جہاد" کیوں نہ کر سکا، لیکن

تھوڑی دیر کے لیے اس تاویل کو مان لیتے ہیں، تو کم از کم یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ صلح کل والے بیانیے اور نظریے پر قائم نہیں رہے تھے، بلکہ حجاج بن یوسف جیسے ''عادل'' کے ساتھ مل کر قتال کرنے کے قائل ہو گئے تھے؛ تو تخلف والے نظریے کی اساس تو بہر حال ختم ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، گرد بیٹھتی گئی، رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیاں سامنے آتی گئیں، دلائل پر غور بڑھتا گیا تو حضرت علیؓ کے خلاف قتال کرنے یا ان کی حمایت سے تخلف کو مطلوبِ شرعی سمجھنے کی رائے تقریباً ختم ہوتی گئی، تا آنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصابت پر اہل السنت کا تقریباً اتفاق ہو گیا۔ متعدد مسائل میں ہوا کہ ابتدا میں تو دلائل میں ابہام کی وجہ سے صحابہ میں کچھ اختلاف ہو گیا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک رائے پر اتفاق ہوتا چلا گیا اور دوسری رائے تقریباً متروک ہو گئی، جیسے ربا الفضل کے جواز کی رائے یا متعۃ النساء کے محدود جواز کی رائے؛ چناں چہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

> إلّا أنّ أهل العصر الثاني من بعدهم اتّفقوا على انعقاد بيعة عليّ ولزومها للمسلمين أجمعين ، وتصويبِ رأيه فيما ذهب إليه ، وتعيين الخطإ من جهة معاوية ومن كان على رأيه، وخصوصا طلحة والزّبير لانتقاضهما على عليّ بعد البيعة له فيما نقل مع دفع التّأثيم عن كلّ من الفريقين كالشّأن في المجتهدين وصار ذلك إجماعا من أهل العصر الثّاني على أحد قولي أهل العصر الأوّل كما هو معروف.

ولقد سئل عليّ رضي الله عنه عن قتلى الجمل وصفّين فقال: «والّذي نفسي بيده لا يموتنّ أحد من هؤلاء وقلبه نقيّ إلّا دخل الجنّة» يشير إلى الفريقين نقله الطّبريّ وغيره فلا يقعنّ عندك ريب في عدالة أحد منهم الخ.[31]

مگر یہ کہ دوسرے دور اور اس کے بعد کے دور والے اس بات متفق ہو گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت منعقد تھی اور وہ تمام مسلمانوں پر لازم تھی [یعنی کسی کا یہ کہنا درست نہیں کہ چوں کہ فلاں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بالفعل بیعت نہیں کی؛ اس لیے اس پر یہ منعقدہ بیعت لازم نہیں اور اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت لازم نہیں] اور یہ کہ جو رائے اختیار کی اس میں حضرت علی صواب تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان جیسی رائے رکھنے

---

۳۱- عبد الرحمن بن محمد بن خلدون، **ديوان المبتدأ والخبر في تاريخ العرب والبربر ومن عاصرهم من ذوي الشأن الأكبر**، ت، خليل شحاده، والأمر الثّالث شأن الحروب الواقعة في الإسلام بين الصّحابة والتّابعين (بيروت: دار الفكر، ١٩٨٨ء)، ١:٢٦٨۔

والوں کی خطا متعین ہے، خصوصا حضرت طلحہ وزبیر، کیوں کہ روایت کے مطابق وہ بیعت کرنے کے بعد حضرت کے خلاف معرکہ آراہو گئے تھے؛ تاہم کسی فریق کو گناہ گار نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔ یہ پہلے دور کے دو قولوں میں سے ایک پر دوسرے دور کا اجماع ہے۔ جیسا کہ معروف ہے [یعنی ایسا ہوتا رہتا ہے]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جمل اور صفین کے مقتولین کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے ان میں جو شخص بھی صاف دل ہونے کی حالت میں فوت ہوا وہ جنت میں ضرور جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فریقین کے مقتولین کی بات کر رہے تھے [صرف ایک فریق کی نہیں] اس لیے ان میں سے کسی کی عدالت میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس گفت گو کا اصل موضوع وہی ہے جو بالکل شروع میں ہی عرض کر دیا ہے۔ ہمارا اصل موضوع خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور احادیث نبویہ ہے۔ حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے یا ان کا ساتھ نہ دینے والے حضرات براہِ راست موضوع نہیں ہیں؛ تاہم جن کے پیشِ نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات یا ان خلافت کی پوزیشن کو کم زور کر کے پیش کرنا ہوتا ہے، ان میں ایسی جرأت بہت کم ہوتی ہے کہ وہ براہِ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موضوعِ بحث بنا سکیں؛ اس لیے وہ عموماً

بالواسطہ بات کرتے ہیں، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو ان جنگوں سے الگ تھلگ رہے، ان کے موقف کو اس طرح سے تعظیم کے ساتھ پیش کیا جائے کہ دیکھنے میں لگے کہ اصل دانش مندانہ راستہ تو یہی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو تلوار اٹھائے رہے، وہ اپنی ذات میں تو کوئی دانش مندانہ طرزِ عمل نہیں تھا، بس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جلالتِ شان کی وجہ سے اس کے بارے میں لب کشائی نہیں کرسکتے۔ جب کہ اہل السنت کا عمومی رخ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والے صحابہ ہوں یا مذکورہ رائے کے ساتھ ان سے تخلف کرنے والے؛ سب کا احترام واجب ہے، انھیں سب و شتم کرنا ناجائز ہے، ان کے دیگر مناقب و کمالات یا کارنامے جو بھی ثابت ہوں انھیں بیان کیا جائے گا، اللہ کے نبی سے نسبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی جائے گی؛ لیکن ان خاص معاملات میں ان کی رائے کی تمجید کرنے کے بجاے ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے گا؛ اس لیے کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ تھا، ان کی راے صواب تھی، فقہاے امت نے اس خاص باب میں ان کے طرزِ عمل کو اہم نمونہ تسلیم کیا ہے۔

نہ چاہنے کے باوجود بھی بات کسی قدر لمبی ہوگئی، پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کا اختتام شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب **تحفہ اثناعشریہ** کے ایک اقتباس پر کیا جائے۔ اقتباس کا پس منظر یہ ہے کہ شاہ صاحب شیعہ کے مختلف طبقات یا فرقے بیان فرمارہے ہیں۔ شیعہ اصل میں کسی کی پارٹی اور اس کے حمایتی کو کہتے ہیں۔ مثلاً کچھ شیعانِ اہلِ شام تھے اور کچھ شیعان علی تھے۔ یہاں شیعانِ علی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حمایتیوں یا ان کی حمایت کے نام لیواؤں کی بات ہورہی ہے۔ شیعان علی میں سب سے پہلا طبقہ وہ ہے جسے شاہ صاحب مخلص شیعہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ در حقیقت اہل السنت کے امام اور مقتدا ہیں۔ شاہ صاحب ان کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی ہونے کے باوجود دیگر کبارِ صحابہ وامہات المؤمنین کے حق کو پہنچانتے تھے، جن صحابہ سے

جنگ وجدل کرتے تھے ان کے بارے میں سینے کو کینے سے محفوظ رکھتے تھے۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں ان کے ہم قدم تھے، اسی طرح اس معاملے میں [دیگر صحابہ کا حق پہچاننے میں] بھی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم قدم تھے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے تفضیلی، غالی اور تبرائی شیعوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تبرائیوں کی طرف سے شیعانِ مخلصین کو بھی برا بھلا کہا جاتا ہے، اس کی مزید تفصیل کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ان شیعان اولی؛ [یعنی شیعانِ مخلصین] کی حالت واقعی قابل رحم ہے کہ شیعوں کے تمام گمراہ فرقوں اور خارجیوں دونوں کی لعنت وملامت کا نشانہ بنے اور سب کے ساتھ مخالفت اختیار کی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وراثت میں مسکنت اور غربتِ عظمی انہی کے نصیب میں آئی اور جنگ وجدال اور مجاہداتِ شاقہ کے لئے ان کے صحیح وارث یہی قرار پائے۔ درحقیقت یہ حدیث ان ہی کے حال پر ٹھیک منطبق ہوئی اور ان کے انجام کا پتا دیتی ہے۔
> إن الدين بدأ غريبا وسيعود غريبا فطوبىٰ للغرباء.

والحمد للہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں آگے چل کر یہ بات کھلے گی کہ شیعانِ اولیٰ میں مہاجرین وانصار کی اس جماعت کا شمار ہے جن میں سے اکثر سعادت مآب جناب مرتضیٰؓ کی ہم رکابی میں باغیوں اور قرآن میں تاویل کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ لڑ چکے تھے! ایسے ہی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی رفاقت میں منکرین قرآن سے لڑائیوں میں شریک رہے تھے اور ان میں سے بعض ایسے تھے جو انتہائی پرہیز گاری اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور اہل کلمہ اور اہل قبلہ کے قتال سے گریز کرتے ہوئے چند

عذر پیش کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اور جن کے سب عذر حضرتِ علیؓ نے قبول فرمائے تھے اور باوجود اس گوشہ نشینی کے انھوں نے آپؓ کے مناقب و فضائل کو پھیلانے اور آپؓ کی محبت پر لوگوں کو ابھارنے اور آپؓ کی عزت و تعظیم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے عمل سے اس آیت کی ترجمانی فرمائی:

لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون حرج إذا نصحوا لله ورسوله ما علی المحسنین من سبیل

(ترجمہ: "نہیں ہے ان ضعیفوں، مریضوں اور ان لوگوں پر جو خرچ کے لیے کوئی مال نہیں رکھتے کوئی حرج، جب کہ وہ اللہ اور رسول کے خیر خواہ ہوں اور نیکوں پر کوئی الزام نہیں۔")

اور آگے چل کر قارئین کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ بیعتِ رضوان کے حاضرین میں سے تقریباً آٹھ سو حضرات نے جنگِ صفین میں دادِ جان نثاری دی [۳۲] اور تین سو نے جامِ شہادت نوش کیا، ان کے علاوہ دوسرے صحابہ

---

۳۲- اگرچہ واقعاتی امور کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم شاہ عبد العزیزؒ نے یہاں ایک بڑی غلط فہمی دور کر دی ہے۔ عام طور یہ تاثر کہ دونوں طرف صحابہ تھے، کچھ اس انداز سے دیا جاتا ہے کہ شاید اس وقت موجود صحابہ کو قدرت نے مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا

آدھا بانٹ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات تو درست ہے کہ دونوں طرف صحابہ تھے، مگر صفین میں دونوں طرف صحابہ کی تعداد اور مرتبہ و مقام دونوں کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شاہ صاحب نے یہاں جو اعداد ذکر کیے ہیں وہ کچھ کم و بیش ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کے افاضلِ صحابہ کی ایک بڑی تعداد حضرت علیؓ کے ساتھ تھی یا آپ کی ذہناً حامی تھی۔ جس طرح حضرت علیؓ کی حمایت میں جانے والی ہر بات کو الجھانے کی بعض لوگوں نے کوشش کی ہے، تعداد کے معاملے کو بھی الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوں کہ اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں، اس لیے یہاں اس پر زیادہ بات نہیں ہو سکتی، تاہم اتنا عرض ہے کہ امام بخاری کے شیخ خلیفۃ بن خیاط اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد الرحمٰن بن ابزی سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت علیؓ کے ساتھ بیعۃ الرضوان والوں میں سے آٹھ سو افراد تھے، جن میں سے تریسٹھ شہید ہوئے (ابو عمرو خلیفہ بن خیاط، **تاریخ خلیفۃ بن خیاط**، ت اکرم ضیا العمری (دمشق، بیروت: دار القلم، مؤسسۃ الرسالۃ) ۱۸۴۔) حضرت ابن عباسؓ جب خوارج کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے گئے تو وہ ان سے سب سے پہلی بات یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم حضرت علیؓ کے لشکر سے الگ کیوں ہوئے ہو؟ تو ابن عباس نے ان سے یہ سوال کرتے ہوئے فرمایا کہ تمھیں رسول اللہ ﷺ کے چچازاد اور داماد اور مہاجرین وانصار پر کیا اعتراض ہے؟ (بیہقی، **السنن الکبری**، ت محمد عبد

وتابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے جو خدمات دین و خلافت کی انجام دیں، نہ کسی زبان کو اس کے بیان کا یارا ہے نہ کسی قلم کو یہ تاب کہ ان کو رقم کر سکے، لیکن چوں کہ دورِ خلافت ختم ہو چکا تھا اور خاتم الخلفاء حضرت امیرؓ کا جامِ حیات لبریز ہو چکا تھا، اس لیے دنیاوی طور پر یہ قربانیاں بار آور نہ ہو سکیں، بجز اس کے کہ وہ حضرات ثوابِ آخرت اور جنت میں درجاتِ بلند کے حق دار ٹھہرے جو مجملہ دو بھلائیوں کے ایک بھلائی ہے۔ (۳۳)

---

القادرعطا،کتاب قتال أهل البغي،باب لا يبدأ الخوارج بالقتال الخ، ۸: ۳۱۰۔) اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک بھی حضرت علیؓ کی جماعت کا مرکزی حصہ مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا، اس لیے حضرت علی سے علیحدگی کو ابنِ عباس مہاجرین وانصار سے علیحدگی شمار کر رہے ہیں۔ خیر! حدیثی اور تاریخی روایات تو اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں، مگر یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے خوارج کی ایک مخصوص جماعت کے خلاف قتال کرنے والی جماعت کی جو فضیلت احادیث سے سمجھ میں آتی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت روے زمین پر حضرت علیؓ کا ساتھ دینے والی اس جماعت سے بہتر کوئی جماعت نہیں تھی۔ یہ بات بظاہر بعید لگتی ہے کہ اس جماعت کو یہ فضیلت اس صورت میں حاصل ہو کہ آپ اپنے ساتھ چند سبائی قسم کے لوگوں کو ساتھ لے کر پھر رہے ہوں۔

۳۳- شاہ عبدالعزیز، **تحفہ اثنا عشریہ**، ۳۰۔